سدا بہار

از

دیبا خانم

۲



آندھی کے چراغ

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہوگا!
ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہوگا!
ذرّے ذرّے پہ جڑے ہونگے کنوارے سجدے
ایک اِک بُت کو خدا اس نے بنایا ہوگا!
پیاس جلتے ہوئے کانٹوں کی بجھائی ہوگی
رِستے پانی کو ہتھیلی پہ سجایا ہوگا!
مِل گیا ہوگا اگر کوئی سنہرا پتھر
اپنا ٹوٹا ہوا دل یاد تو آیا ہوگا!

مینا کماری

نسیمہ کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ آٹھ سال تک سہاگن رہ چکی ہے اور اب چھ سال سے ایک بیوہ کی زندگی گذار رہی ہے۔

پہلی نظر میں وہ بالکل کنواری لڑکیوں جیسی لگتی تھی۔ ہلکا پھلکا سا قد، بھرا بھرا سا بدن، چہرے پر وہی دوشیزگی کا نکھار۔ بعض عورتیں ہوتی ہیں جو قدرتی طور پر سدا بہار ہوتی ہیں نسیمہ کے جسم کی بہار بھی جوبن کی توں قائم تھی۔ اگر کوئی اسے ایک بیوہ تسلیم کر بھی لیتا تو یہ ہرگز تسلیم نہ کرتا کہ وہ لیلیٰ کی ماں ہے۔

ایسی حقیقتیں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں کہ ماں بھی جوان ہو اور بیٹی بھی۔ دونوں میں انیس بیس کا فرق تھا۔ لیلیٰ ابھی چودہ سال کی تھی۔ چھوٹا قد، دبلا پتلا سا جسم، چہرے کے نقوش بڑے تیکھے تھے۔ رخساروں پر کبھی کبھی سرخی دوڑ جاتی تھی۔ ورنہ رنگ ایسا سفید تھا جیسے کورا کاغذ ہوتا ہے۔ چہرے کا حسن ماں سے بھی سوا تھا لیکن جسامت میں دونوں ایک تھیں۔

نسیمہ کو پیچھے سے دیکھو تو لیلیٰ کا دھوکہ ہوتا تھا۔ اور لیلیٰ کو دور سے دیکھو تو نسیمہ کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن دونوں کو بیک وقت قریب سے دیکھ کر ماں اور بیٹی کے فرق کی وضاحت ہوجاتی تھی۔ لیلیٰ کے چہرے پر صبح کی تازگی تھی اور نسیمہ کے چہرے پر شام کروٹیں بدل رہی تھی ایسی شام جو ڈوبنے سے پہلے شفق کی لالیوں سے پُر دلفریب ہوجاتی ہے دونوں کو بغور دیکھنے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ نسیمہ کا جسم زندگی کی اونچ۔ نیچ سے گذر کر ذرا بھاری بھر کم سا ہوگیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیلیٰ ابھی صرف چودہ سال کی تھی۔ ابھی اس کا جسم آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ اور ابھی نسیمہ کے پرانے جوڑے جو تنگ ہونے لگے تھے اس کے جسم پر پورے اترتے جا رہے تھے

ویسے ذہانت کے اعتبار سے ماں بیٹی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نسیمہ نے زندگی کا ایک بڑا حصہ گھر کی چار دیواری میں گذارا تھا۔ خاوند کی زندگی میں کبھی اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کہ وہ دو چار پیسوں کی چیزیں خریدنے کے لئے گھر سے باہر قدم نکالتی۔ بیٹھے بٹھائے تمام ضرورتیں پوری ہوجاتی تھیں۔ کبھی سیر و تفریح کے لئے نکلتی تو سات سیر کا برقعہ لاد کر اور اپنے خاوند کا ہاتھ تھام کر اس طرح گھبرائی گھبرائی سی چلتی۔ جیسے گھر کی چار دیواری سے پہلی بار نکلی ہو۔ راستوں اور بازاروں میں لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر وہ بدحواس ہوجاتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پہ گھبرا جانا اس کی بچپن کی عادت تھی

اس کے برعکس لیلیٰ گھر کی بجائے کھلی فضا میں سانس لینے کی عادی تھی وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی ذہین بھی تھی۔ گھر اور محلے سے لے کر اسکول تک تمام لوگ اس کی سمجھ بوجھ اور حاضر دماغی کے قائل تھے۔ محلے کی عورتیں تو یہاں تک کہتی تھیں کہ خاوند کے مرنے کے بعد اگر بیٹی نہ ہوتی تو نسیمہ کبھی کی فاقوں سے مر چکی ہوتی۔

بیوہ ہونے کے بعد چار سال تک خاوند کی چھوڑی ہوئی پونجی سے گذارا ہوتا رہا۔ چھوٹی موٹی جائیداد اور گھر کے ساز و سامان بیچ کر وہ فاقوں کو ٹالتی رہی لیلیٰ بہت ہی حساس طبیعت کی لڑکی تھی۔ گھر کے حالات اور زندگی کی تلخیوں نے اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھوں کی طرح سوچنا سکھا دیا تھا تیرہ برس کی عمر میں ہی اس نے ایک ایسی ٹیوشن حاصل کر لی تھی جہاں سے پچاس روپے ماہوار مل جاتے تھے اس کے علاوہ راتوں کو بیٹھ کر وہ کاغذ کے تھیلے بناتی تھی اور دوسری صبح انہیں پرچون کی دکانوں میں بیچ دیتی تھی۔ اسکول کی آدھی فیس معاف تھی۔ باقی آدھی فیس اور کتابیں اسے اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے مل جاتی تھیں۔ اپنے ہوں یا پرائے، سب اس کی ذہانت اور محنت سے متاثر ہو کر اس کے کام آتے رہتے تھے۔

مہنگائی بڑھتی جا رہی ہو تو پچاس روپے اور کاغذ کے تھیلے کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔ محلے کی عورتوں نے نسیمہ کو سمجھایا کہ وہ بھی ذرا گھر سے باہر نکلے اور کسی کے ہاں پکانے اور برتن دھونے کا کام پکڑ لے۔ اس طرح دو وقت کی روٹیاں تو آسانی سے مل جایا کریں گی۔ اور لیلیٰ کی پریشانیاں بھی کچھ کم ہوجائیں گی۔ عورتوں کا مشورہ نہایت ہی مناسب تھا۔ وہ خود ہی لیلیٰ کو اتنی سی عمر میں محنت مزدوری کرتے دیکھ کر کڑھتی رہتی تھی کہ ان پر یہ برا وقت آ پڑا ہے۔ اپنے آپ کو وہ اس قابل نہیں سمجھتی تھی۔ کہ باہر جا کر ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ اور کہیں سے چار پیسے حاصل کر سکے۔ محلے کی عورتوں نے جب اسے مہذب انداز میں اور کبھی طنزیہ انداز میں کہنا شروع کیا تو وہ پریشان ہوگئی۔

"میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے کہا "کہاں جاؤں؟ باہر کے راستے میری سمجھ میں نہیں آتے۔"

"تمہیں محلے سے باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" ایک عورت نے کہا یہاں

بہت سے ایسے گھرانے ہیں جہاں تمہیں کام مل سکتا ہے۔ کل ہی صمد بیوپاری کی گھر والی کہہ رہی تھی کہ اسے ایک ملازمہ کی ضرورت ہے۔ تم وہاں جا کر دیکھو تو سہی۔ اگر وہاں تمہارا کام نہ بنا تو میں تمہارے لئے دوسری جگہ کوشش کر دوں گی۔"

"اچھا! نسیمہ نے کہا" تم کہتی ہو تو میں وہاں چلی جاؤں گی۔ ذرا لیلیٰ آئے تو میں اس سے بھی پوچھ لوں......"

وہ اپنے ذہن سے کوئی قطعی فیصلہ کرنے کی عادی نہیں تھی۔ جب تک وہ سہاگن رہی، خاوند کے اشاروں پر چلتی رہی۔ بیوہ ہونے کے بعد اب ہر معاملے میں لیلیٰ سے پوچھ کر اس کے مشورے کے مطابق قدم اٹھانے لگی تھی۔

لیلیٰ نے جب یہ سنا کہ ماں کسی کے ہاں ملازمت کرنے پر آمادہ ہے تو اس نے انکار نہیں کیا۔ وہ خود ہی چاہتی تھی کہ ماں گھر میں بیٹھی نہ رہے۔ باہر کی دنیا کو بھی ذرا دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

"یہ تو اچھی بات ہے امی! کہیں سے چار پیسے کی آمدن ہو تو ضرور کوشش کرنی چاہیئے۔ کس کے ہاں ملازمت مل رہی ہے؟"

"صمد بیوپاری کے ہاں!"

"وہ تو بہت اچھے لوگ ہیں۔ ہمارے گھر سے ان کی کوٹھی زیادہ دور نہیں ہے آپ تنہا آجا سکتی ہیں۔ لیکن ایک بات ہے آپ پرانے زمانے کا برقعہ پہن کر نہ جائیں مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔"

"بُرا لگتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پردہ کرنا چھوڑ دوں۔"

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ پردہ کرنا چھوڑ دیں۔ اپنے ہی محلے کی بات ہے۔ آپ چادر اوڑھ کر بھی جا سکتی ہیں صمد بیوپاری کے ہاں پردے کا رواج نہیں ہے اس کی بیوی بچے آپ کا تاریخی برقعہ دیکھ کر ہی سہم جائیں گے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ انسان کو وقت اور ماحول کے مطابق ڈھلنا چاہیئے"

نسیمہ جواباً کچھ نہ کہہ سکی۔ خاموش ہو کر سوچتی رہ گئی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ لیلیٰ کے ابا پہلے پہل قمیض پاجامہ کے سوا کوئی دوسرا لباس نہیں پہنتے تھے۔ لیکن جب سے صاحب بہادر کے ہاں پانچ سو روپے کی ملازمت ملی تھی۔ وہ پتلون اور بش شرٹ پہننے لگے تھے۔ کہتے تھے کہ ولایتی صاحب کی ملازمت کا معاملہ ہے جیسا دیس ویسا بھیس اس لئے انہوں نے بھیس بدل لیا تھا۔ بیٹی بھی یہی مشورہ دے رہی تھی۔ ٹھیک تو ہے جب سے ملک آزاد ہوا ہے دولت مند گھرانوں کا رہن سہن ہی بدل گیا ہے بالکل ولایتی صاحب لوگوں کی طرح رہنے لگے ہیں اب وہاں ملازمت کرنی ہے تو انہی کی پسند کے مطابق چلنا ہوگا۔

"لیکن میں پردہ ضرور کروں گی" اس نے دل ہی دل میں کہا اور پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

لیلیٰ بچوں کو پڑھانے چلی گئی تھی۔ اس نے چارپائی سے ایک سفید دھلی ہوئی چادر اٹھائی اور اپنے آپ کو اس میں اچھی طرح لپیٹ کر بسم اللہ پڑھتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ لوگ ایک دو کی تعداد میں گلیوں سے گذر رہے تھے۔ ان راہ گیروں میں کچھ عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اگر وہ نظر نہ آتیں تو نسیمہ شاید خود کو اس دنیا کی اکیلی عورت سمجھ کر الٹے پاؤں واپس آ جاتی...... وہ دل کو سمجھاتی اور کسی طرح ڈرتی کانپتی صمد بیوپاری کی کوٹھی تک پہنچ گئی۔

کوٹھی کے بڑے سے کمرے میں بیگم صاحبہ بیٹھی ہوئی چند مہمان خواتین سے باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے سر سے پاؤں تک نسیمہ کو ایک نظر دیکھا اس کے آنے کا مقصد معلوم کیا۔ اور پھر پتہ نہیں وہ نسیمہ کو ٹالنا چاہتی تھیں یا واقعی کسی اہم گفتگو

یں مصروف نفیس نہو کی نے مختصر الفاظ میں کہہ دیا۔

"ہمیں فی الحال ملازمہ کی ضرورت نہیں ہے......"

نسیمہ مایوسانہ جواب سن کر بھی کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ نے پلٹ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے سنا نہیں ــــــ؟"

"جی ہاں" نسیمہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا تھا کہ آپ کو ملازمہ کی ضرورت ہے اس لئے میں......"

بیگم صاحبہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں کیا تم سے جھوٹ بول رہی ہوں؟"

"جی، جی نہیں......"

"تو پھر جاؤ ــــــ! خواہ مخواہ پریشان نہ کرو۔"

وہ مایوسی سے پلٹ گئی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کوٹھی سے باہر چلی آئی۔ شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ بڑے راستے پر لوگ چل پھر رہے تھے لیکن گلیاں سنسان سی تھیں۔ اِکّے دُکّے راہگیر کبھی کبھی نظر آجاتے تھے اور پھر جلد ہی کسی گلی کے موڑ پر غائب ہوجاتے تھے۔ نسیمہ کا دل ہولے ہولے دھڑکنے لگا وہ دن کی روشنی میں کبھی تنہا گھر سے نہیں نکلتی تھی

گلی کے اطراف اونچے اونچے مکانات آسیبی سائے کی طرح پھیلے تھے اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا اور اپنی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دی۔

ایک گلی سے دوسری گلی کی طرف مڑتے ہوئے اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا سا آیا۔ اور کسی نے اس کی کلائی پکڑ لی...... مارے خوف کے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی اور سر پر رکھی ہوئی چادر بدحواسی میں نیچے آگری۔

اس کے سامنے محلے کا دادا بابے کھڑا ہوا اپنی بتیسی دکھا رہا تھا۔ بابے کا چہرہ دیکھتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

بڑی بڑی خونی آنکھیں۔ اور ایک گال پر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا چاقو کے زخم کا نشان اس کی شخصیت کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہا تھا۔ اس کے نام سے سب ہی خوف کھاتے تھے اس وقت گلی سے گزرنے والے دو ایک آدمیوں نے نسیمہ کی کلائی کو اس کی گرفت میں دیکھا تھا لیکن وہ انجان بن کر یوں جلدی سے کترا کر نکل گئے تھے۔ جیسے انہیں ذرا بھی دیر ہوئی تو بابے اپنے چہرے پر پڑے ہوئے چاقو کے زخم کا نشان ان کے سینے پر بنا دے گا۔

اس نے بڑے بڑے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

"جانِ من! معلوم ہوتا ہے اس محلے میں نئی نئی آئی ہو؟"

"چھوڑو میرا ہاتھ......! وہ زور لگا کر اپنی کلائی چھڑانے لگی۔

"اپنے محلے کی عورتوں کو چھیڑتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میں طاہر علی پیش کار کی بیوہ ہوں۔"

"تو بیوہ......؟" بابے نے اسے غیر یقینی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں......" وہ یک بیک رونے لگی۔

"اری جا! مجھے الو بناتی ہے جیسے میں نے کبھی عورت دیکھی ہی نہیں ہے"!

"یقین کرو میں ایک غریب بیوہ ہوں۔ اس طرح میرا راستہ نہ روکو ورنہ میں بدنام ہوجاؤں گی۔

وہ رو رو کر دہائی دینے لگی۔ بابے اس کے چہرے اور جسم کی شادابی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی مونچھ کے ایک سرے کو بل دیتے ہوئے کہا۔

"اگر تو بیوہ ہے تو میں آج سے کنواریوں پر لعنت بھیجتا ہوں تو رہتی کہاں ہے

کریم مستری کے مکان میں ...."

"ہوں .... تو پھر جا! اس نے کلائی چھوڑ دی اور اسے بھوکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا ٹیکس وصول کرنے کسی وقت آ جاؤں گا۔"

وہ ہنستا ہوا اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ نسیمہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑی خوف سے کانپتی رہی۔ پھر جلدی سے اپنی چادر اٹھا کر اپنے آپ کو لپیٹتی ہوئی گھر کی طرف بھاگتی چلی گئی۔

لیکن ——— اب وہ چادر کی چاردیواری میں چھپ کر کیا کرتی وہ تو ایک رنگین اشتہار کی طرح بالے کی نظروں میں آ چکی تھی۔

وہ ہانپتی کانپتی اپنے گھر میں واپس چلی آئی۔

اس گھر میں جہاں آج تک اس کے خاوند کے سوا کسی نے اس کی کلائی نہیں پکڑی تھی۔ لیکن آج اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ اس دنیا میں بے یار و مددگار رہ گئی ہے اب تو جو چاہے وہی آ کر اس کی کلائی پکڑ سکتا ہے اس بدمعاش نے یہی تو دھمکی دی تھی کہ وہ کسی وقت بھی اس کے گھر میں چلا آئے گا۔

"کیا اس بدمعاش کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔"

اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس محلّے کے دو آدمی بالے سے اسے نجات دلانے کی بجائے کترا کر چلے گئے .... اب وہ کس سے فریاد کرے؛ وہ گھر آ کر چین سے بیٹھ بھی نہیں سکی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بدمعاش

ابھی دھڑ دھڑاتا ہوا کمرے میں گھس آئے گا۔ بیلی بھی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ خالی خالی کمرے کی تنہائی اسے اور ڈرائے جا رہی تھی۔

وہ پھر چادر اٹھا کر دروازے پر آئی۔ اور باہر جھانک کر دیکھنے لگی۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ ورنہ ایک الیکٹرک پول کا بلب اونگھتی ہوئی آنکھ سے اسے دیکھ رہا تھا اس نے اچھی طرح چادر لپیٹ کر دروازے کو باہر سے بند کیا اور پڑوسن کے گھر میں چلی آئی۔

پڑوسن نے اسے خوفزدہ دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے بہن؟"

"کیا بتاؤں نجو کی ماں! میں اس لئے باہر نہیں جاتی کہ چور بدمعاش پھرتے رہتے ہیں تم لوگوں کے کہنے پر میں صمد بیوپاری کے ہاں گئی تھی۔ بیگم صاحبہ نے تو ٹکا سا جواب دے دیا کہ نوکری نہیں ہے واپس آنے لگی تو رشیدے چاچا کی گلی میں اس لفنگے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا......"

یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔ نجو کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کس نے ہاتھ پکڑ لیا تھا؟"

"وہی لفنگا، بدمعاش بالے پوچھنے لگا کہ میں کہاں رہتی ہوں۔ میری بھی عقل ماری گئی تھی۔ بدحواسی میں اسے گھر کا پتہ بتا دیا۔ نہ بتاتی تب بھی وہ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ جاتا۔"

"ذلیل..... کمینہ......" نجو کی ماں اسے گالیاں دینے لگی۔

"اور کہتا تھا کہ کسی وقت میرے گھر آئے گا۔ ہائے! میں کمزور عورت کہاں جاؤں۔ تم نجو کے ابا سے کہو بہن .... وہی اس بدمعاش کی خبر لیں گے۔"

نجو کی ماں نے دوسرے کمرے کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔

"سنتے ہو جی!........ یہ لیلیٰ کی ماں کیا کہہ رہی ہیں۔ اب تو اس بدمعاش کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ محلّے کی عورتوں کو چھیڑنے لگا ہے۔"

دوسرے کمرے سے ایک مردانہ آواز نے ذرا کھانس کھنکار کر کہا۔

"میں تمام باتیں سُن رہا ہوں۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ کوئی بھی شریف آدمی اس بدمعاش سے الجھنا نہیں چاہتا۔ ذرا کچھ کہو تو غنڈوں کی فوج لئے آدھمکتا ہے۔"

نسیمہ نے چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"بھیا! لیلیٰ کے ابا زندہ ہوتے تو میں آپ کو کبھی تکلیف نہیں دیتی۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میری طرف سے بولنے والا کوئی رہے۔ میں کل ہی اس محلے میں پنچایت بٹھاؤں گی۔ آپ صرف اتنا کریں کہ محلے کے چند شریف بزرگوں تک اس پنچایت کا پیغام پہنچا دیں۔"

دوسرے کمرے سے کوئی جواب نہ ملا۔ شاید نسیمہ کی بات پر غور ہو رہا تھا نجو کی ماں نے پوچھا "آپ خاموش کیوں ہو گئے۔"

میں سوچ رہا ہوں نجو کی ماں! کہ پنچایت میں میرا پیش پیش رہنا مناسب ہے یا نہیں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ وہ اب تک تین لڑکیوں کو اغوا کر چکا ہے لوگوں کو اس پر شبہ ہے لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر پنچایت بلانے کی وجہ سے وہ میرا دشمن بن گیا تو سب سے پہلے میرے ہی گھر کا رخ کریگا میرے گھر میں دو جوان بیٹیاں ہیں میں انہیں کہاں چھپاتا پھروں گا"

نجو کی ماں بھی دم سادھ کر رہ گئی۔ وہ بھلا کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ نسیمہ کی وجہ سے اس کی لڑکیاں ایک بدمعاش کی نظروں میں آجائیں۔

"یہی وجہ ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کے منہ نہیں لگتا۔" نجو کے باپ نے کہا۔ "بہن جی سے کہو کہ وہ صابن والے خدا بخش کے پاس چلی جائیں۔ وہی اس غنڈے کو ٹھیک کر سکتا ہے......"

نسیمہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سب ٹالنے والی باتیں ہیں۔ اس لئے وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔

لیلیٰ نے جب یہ سنا کہ بابے نے اس کی ماں کو میلی نظروں سے دیکھا ہے تو وہ غم و غصہ سے کانپنے لگی۔

"امی آپ کتنی بدنصیب ہیں" اس نے اداس لہجے میں کہا۔ "میری جگہ اگر آپ کا کوئی جوان بیٹا ہوتا تو آپ کے لئے بابے جیسے بدمعاشوں سے ٹکرا جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔"

نسیمہ نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔

"ایسی باتیں کیوں کہتی ہے تو میرے لئے بیٹوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ اب اکیلی جان ہو کر ساری دنیا سے تو نہیں لڑ سکتی میں سوچتی ہوں کہ خدا بخش کے ہاں جا کر اپنا دکھڑا رو دیتی ہوں وہ بڑا ہی اثر و رسوخ والا آدمی ہے بابے کو وہی ٹھیک کر سکتا ہے۔"

ایسے وقت لیلیٰ تو کیا محلے کا ہر شخص یہی مشورہ دیتا کہ نسیمہ کو خدا بخش کے سامنے جا کر شکایت کرنی چاہیئے........ خدا بخش صابن بنانے والی ایک بہت بڑی فیکٹری کا مالک تھا۔ اچھی خاصی زمینیں بھی تھیں۔ اگرچہ یہ تمام زمینیں اور جائیداد اس کی بیوی کے نام پر تھیں۔ تاہم وہ گھر داماد بننے سے اس دولت پر عیش کر رہا تھا۔ اور اب سوسائٹی میں اچھا مقام پیدا کرنے کے لئے محلے کا چیئرمین بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ الیکشن جیتنے کی خاطر وہ آج کل خود ہی لوگوں کے دروازوں تک چل کر آتا تھا اور انہیں یقین دلایا کرتا تھا کہ چیئرمین بننے کے بعد ان کے

سارے دلدّر دور کر دے گا

دوسری صبح نسیمہ اس مہربان شخص کے ہاں فریادی بن کر پہنچ گئی۔ ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں محلے کی ایک عورت پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی غریبی کا دکھڑا رو کر اس سے مالی امداد مانگ رہی تھی۔

نسیمہ چادر لپیٹے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو خدا بخش تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت اپنی رام کہانی سنائے جا رہی تھی۔ لیکن اب سننے والے کا ذہن بٹ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس عورت کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور کہا۔

"اچھا تم ابھی جاؤ، میں تمہارے لئے کام کا بندوبست کروں گا۔"

روپے لے کر وہ عورت اسے دعائیں دیتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور اپنا برقعہ سنبھال کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

نسیمہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت کے جاتے ہی وہ خود کو یکہ تنہا محسوس کرنے لگی۔ خدا بخش لاکھ رحم دل اور غریب پرور سہی۔ لیکن پھر بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس لیے وہ نظریں ملا کر کچھ کہتے ہوئے جھجھک رہی تھی۔

اس نے بدستور سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"میں ایک غریب بیوہ ہوں۔ یہاں کریم مستری کے مکان میں رہتی ہوں میں یہ کہنے آئی تھی کہ ......"

"تم بیوہ ہو......؟" خدا بخش نے اس کی بات کاٹ کر حیرت سے کہا

جی ہاں...! میرے ہاں کوئی ایسا مرد رشتے دار نہیں ہے۔ جو ہمیں بدمعاشوں اور لفنگوں سے محفوظ رکھ سکے۔ آپ غریب پرور ہیں اور غریبوں

کے دکھ درد کا خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کے پاس فریاد لیکر آئی ہوں"

خدا بخش ایک ٹک اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں سینک رہا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے محلے میں ایسے ایسے ہیرے بھی ہیں جو گھر کی چار دیواری میں چھپے رہتے ہیں۔

پھر اس نے اپنی سوچ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"کیسی فریاد......؟"

"کل میں صمد بیوپاری کے ہاں کام دھندے کی تلاش میں گئی تھی واپسی پر اس لفنگے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے دھمکی دینے لگا کہ مجھے محلے میں عزت سے نہیں رہنے دے گا۔

خدا بخش نے جلال میں آ کر صوفے کے ہتھے پہ ہاتھ مار کر پوچھا۔

"کون ہے وہ بدمعاش؟ میرے محلے کی عورتوں کو چھیڑنے کی اُسے جرأت کیسے ہوئی؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔ وہی لفنگا بالے ہے۔"

"بالے......؟"

بالے کا نام سنتے ہی خدا بخش سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے سے تذبذب کے آثار جھلکنے لگے۔

اب ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ بالے جیسے غنڈہ سے خوف کھاتا ہو۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ نسیمہ جیسی حسین فریادی کے لیے بالے کو جوتے مار مار کر جیل بھجوا دیتا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سامنے الیکشن آ گیا تھا۔ اور الیکشن میں ہار جیت کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ وہ اپنی دیانت داری سے نہیں، بلکہ غنڈوں کے جعلی ووٹ بھگتانے سے چیئرمین بن سکتا ہے۔ اس سلسلے میں

غنڈوں کا دادا بارے اس کا دست راست بنا ہوا تھا۔ لہذا وہ فی الحال بارے کے خلاف کوئی قدم اٹھا کر اسے اپنا دشمن نہیں بنا سکتا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر تک اچھی طرح غور کرنے کے بعد کہا۔

"اچھی بات ہے۔ میں بارے کو سمجھا دوں گا۔ وہ اب تمہیں نہیں چھیڑے گا۔ لیکن۔۔۔۔"

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر عجیب انداز میں مسکرانے لگا۔ پھر آہستگی سے کہا۔

"تمہیں بھی اس طرح تنہا زندگی نہیں گذارنا چاہیئے۔"

"ہم، مگر میں کیا کروں۔ میکے اور سسرال کی طرف سے میرا کوئی بھی رشتہ دار نہیں ہے سب ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔"

"مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔ میں تمہیں بہترین مشورہ دیتا ہوں کہ کسی کو اپنا سہارا بنا لو۔"

"جی۔۔۔۔؟" نسیمہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔۔۔"

"سیدھی سی بات کہہ رہا ہوں کہ تم تنہا اتنی لمبی زندگی کسی مرد کے بغیر نہیں گذار سکو گی۔ آج میں تمہیں بارے سے بچا لوں گا۔ لیکن زندگی کے ہر موڑ پر ایسے کتنے ہی بارے ملیں گے۔ تم کہاں تک ان سے بچتی رہو گی؟"

نسیمہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ بے چینی سے پہلو بدلنے لگی۔ خدا بخش نے اس کی جھجک دور کرنے کے لیے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

"تم نے ابھی کہا تھا کہ صمد بیوپاری کے ہاں گئی تھیں۔ کیا وہاں ملازمت کرتی ہو؟"

"جی نہیں، انہیں ملازمہ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہم۔۔۔۔!" اس نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے تو میرے ہاں دو وقت کی روٹیاں پکا جایا کرو۔ میری بیوی اور بچے گاؤں میں رہتے ہیں۔ اس لیے مجھے کھانے پینے کی تکلیف ہوتی ہے۔"

"جی۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔!" وہ کہتے ہوئے جھجکنے لگی۔

"مگر کیا۔۔۔۔؟" اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔ "کیا مجھ سے خوف محسوس ہوتا ہے۔؟"

"جی۔ جی نہیں تو۔۔۔۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ آپ کے بیوی بچے نہیں ہیں۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔۔۔۔"

وہ قہقہہ لگانے لگا۔

"کسی کی مجال ہے کہ میرے گھر میں قدم رکھنے والی کسی عورت کے متعلق بات بنا سکے۔ یہاں اکثر محلے کی عورتیں کچھ نہ کچھ مانگنے کے لیے آیا کرتی ہیں — کیا تم نے ان کے متعلق کبھی کوئی غلط بات سنی ہے؟"

"جی نہیں۔۔۔۔!" اس نے اعتراف کیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی کہ ایک عورت یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اب تک کسی کی بھی زبان سے خدا بخش کی برائی نہیں سنی تھی۔ پھر وہ کس طرح اس پر شبہ کر سکتی تھی۔ اس لیے سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

خاموشی نیم رضامندی سمجھی جاتی ہے۔ خدا بخش نے اس کے آگے چارہ پھینکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معقول تنخواہ ملے گی۔ تین وقت کے کھانے کے علاوہ تیس روپے۔۔۔۔ اگر یہ بھی کم ہے تو پھر تم ہی کہو کہ کتنی تنخواہ سے تمہارا گذر ہو گا!"

"جی مجھے تو کوئی انکار نہیں ہے۔ میں لیلیٰ سے پوچھ کر جواب دوں گی۔"

"لیلیٰ کون ....؟"

"میری لڑکی ہے وہ ہاں کہہ دے گی تو میں کل سے کام کرنے آؤں گی۔"

خدا بخش اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ دیکھنے پر تو وہ بیوہ بھی نہیں لگتی تھی اور اب کہہ رہی تھی کہ ایک لڑکی بھی ہے۔ وہ بے خیالی میں پھر آنکھیں سینکنے لگا

"اچھا میں جاتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور چادر سنبھالنے لگی۔

خدا بخش نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی بہت سمجھدار ہے۔ اس لیے اس سے مشورہ لینا چاہتی ہو۔ بہرحال اسے اتنا سمجھا دینا کہ تم اگر میری چھت کے نیچے رہو گی تو کوئی تم پر انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور اس کی جانب بڑھا دیئے۔

"اسے رکھو۔ اگر تم کام کرنے لگو گی تو یہ تمہاری تنخواہ سے نہیں کاٹے جائیں گے"

"جی جی نہیں ......؟" وہ ایک جانب سمٹ کر رہ گئی۔

"غیروں کی طرح انکار نہ کرو" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میں تمہیں اپنا سمجھ کر یہ روپے دے رہا ہوں۔"

"آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ اگر مانگ کر یا احسانات اٹھا کر گذارا کرنا ہوتا تو میں ملازمت تلاش نہ کرتی۔"

اتنا کہہ کر وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

"خوددار ہے ......!"

وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

دوسرے دن سے وہ کام پر آ گئی۔ لیلیٰ کو اس نے راضی کر لیا تھا۔ کہ خدا بخش کے ہاں کام کرنے سے کوئی غنڈہ اسے پریشان نہیں کرے گا۔ اور دو دو وقت کے فاقوں کی نوبت بھی نہیں آئے گی۔ تنخواہ کے علاوہ تین وقت کی روٹیاں بھی مل جایا کریں گی۔

بہرحال وہ روٹی اور کپڑے کی فکر میں اس کی کوٹھی تک چلی آئی تھی۔ لیکن خدا بخش کی پہنچ سے دور ہی دور رہا کرتی تھی۔ وہ محلے کا ہونے والا چیئرمین تھا اور عزت دار آدمی تھا۔ اس لیے کھل کر اپنی گندی ذہنیت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اور نسیمہ بھی ایسی ٹھس ثابت ہوئی تھی کہ اس کے ذو معنی فقروں اور معنی خیز اشاروں کو سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔

آخر جب اشارے کنائے کا ہر حربہ ناکام ہو گیا تو اس نے ہار کر بابے کا سہارا لیا۔ دولت مندوں کے آڑے وقت میں پیسہ اتنا کام نہیں آتا۔ جتنا کہ غنڈے کام آتے ہیں۔

بابے نے اس کی مشکلات کا حال سن کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں جناب! آپ کا حکم ملتے ہی میں نے نسیمہ کا خیال بھی دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن آپ بھی ایسے ہی رہ گئے۔ ویسے برا نہ مانئے گا عورت کی کلائی پکڑنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"یہ حوصلہ کی بات نہیں بابے! عورت سے بھلا کون ڈرتا ہے۔

"بس ذرا اپنی عزت اور شہرت کا خیال آ جاتا ہے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں لیکن تمہیں ان باتوں کی پرواہ نہیں ہوتی۔ بلا جھجک کسی پر بلا بول دیتے ہو۔"

بابے نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بُڈھی کے لیے بدنامی کیا ڈرنا؟ آپ جیسے شریف آدمیوں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ گناہ کے لیے للچاتے رہتے ہیں کہ کوئی پھل آپ ہی آپ ڈال سے ٹوٹ کر جھولی میں آجائے...... بھئی، یہ آپ کے بس کا کام نہیں ہے....

"ایسا نہ کہو بابے! کوئی تدبیر سوچو۔ وہ کمبخت جس قدر مجھ سے دور رہتی ہے اسی قدر میرا دل تڑپتا رہتا ہے۔"

"بھئی تدبیر کی کیا بات ہے۔ رات کو سناٹا رہتا ہے۔ جس وقت وہ کام سے فارغ ہو کر جاتی ہے۔ اسی وقت آپ اس کا راستہ روک لیں۔"

یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے۔ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اپنا کام ختم کر کے چلی جاتی ہے۔"

بابے نے کچھ دیر سوچتے ہوئے کہا۔

"اسے اندھیرا ہونے تک روک لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ٹھیک اس کے رخصت ہونے سے پہلے اس سے کہنا کہ آپ کے کچھ مہمان آرہے ہیں۔ اس لیے ایک آدھ ہانڈی زیادہ تیار کرے۔ وہ آپ کی ملازمہ ہے۔ انکار نہیں کر سکے گی۔ اس طرح زیادہ پکوان کی وجہ سے واپسی تک رات ہو جائے گی۔"

"ہاں.....!" خدابخش نے قائل ہو کر کہا "تدبیر تو ٹھیک ہے۔ لیکن...."

"پھر یہ لیکن کہاں سے آگیا.....؟"

"وہ دراصل بات یہ ہے.....!" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "کہ اگر وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی تو؟ میں اصل میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ اس طرح خوفزدہ ہو جائے کہ پھر چیخنے چلانے اور بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔"

"ہوں.....!" بابے پھر سوچ میں پڑ گیا۔

وہ دونوں تھوڑی دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے... زن، زر اور زمین

کے لیے انسان ازل سے اسی طرح سوچتا آیا ہے۔ اور اپنی سازشوں کے ذریعہ دو روٹیاں کھا کر پرسکون زندگی گذارنے والی پاکباز عورتوں کو اسی طرح اجاڑتا آیا ہے۔

وہ سوچتے رہے.... سوچتے رہے..... پھر بابے نے اچانک اچھل کر کہا۔

"بن گیا کام.... آپ یہی چاہتے ہیں نا! کہ وہ خوف اور دہشت کی وجہ سے نہ تو چیخ سکے اور نہ ہی کہیں بھاگ کر خود کو بچا سکے؟"

"ہاں ہاں۔ میں یہی چاہتا ہوں۔"

"پھر تو یہ کام چٹکی بجاتے ہی ہو جائے گا۔ شام کو میں اور میرے ساتھی اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو جائیں گے وہ میری شکل دیکھتے ہی اس کوٹھی سے باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرے گی۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"کیسی زبردست تدبیر ہے...... کوٹھی کے اندر آپ کا خوف طاری ہوگا۔ باہر میں دہشت پھیلائے کھڑا ہوں گا۔ ایسے میں اس سہمے ہوئے پنچھی کو ذبح کرنا کون سا مشکل کام ہے.... کیوں ٹھیک ہے نا؟"

خدابخش نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کہا۔

"خدا کی قسم، بڑی لاجواب تدبیر ہے۔ مزہ آگیا.... آج دیکھوں گا کہ وہ مجھ سے کیسے بچ کر جائے گی۔

پھر دونوں کے قہقہے بڑی دیر تک کوٹھی کے ایوان میں گونجتے رہے۔

ہیڈ مسٹریس گم سم بیٹھی ہوئی لیلیٰ کی دُکھ بھری داستان سنتی رہی۔

چودہ سال کی معصوم زبان میں اتنے سارے دُکھ سمٹ آئے تھے کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

اس نے لیلیٰ کو اپنے قریب بلا کر سینے سے لگا لیا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم نے پہلے کیوں نہ بتایا کہ اتنی دقتوں سے تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ تم کاغذ کے تھیلے بنا کر اپنے تعلیمی اخراجات کیسے برداشت کر رہی ہو؟"

لیلیٰ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"میں چھٹی کے بعد گھر جا کر یہی کام کرتی ہوں۔ آدھی فیس تو آپ نے معاف کرا دی تھی۔ کتابیں اور کاپیاں بھی آپ کی مہربانی سے مل جاتی ہیں۔ باقی آدھی فیس اور آٹے دال کے اخراجات تھیلوں کی آمدنی اور پچاس روپے کی ٹیوشن سے پورے ہو جاتے ہیں۔"

"پھر بھی ......!" ہیڈ مسٹریس نے تشویش کا اظہار کیا۔ "اب تم نویں جماعت میں ہو۔ تمہیں تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے ... تم ہر سال اول آتی ہو۔ یہ ریکارڈ ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔ میرا مشورہ ہے کہ آئندہ تم تھیلے بنا کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم بہت اچھی طالبہ ہو۔ میں تمہیں اس طرح برباد نہیں ہونے دوں گی۔ بہتر یہ ہے کہ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو۔ مجھ سے بلا جھجک کہتی رہو۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔"

"آپ کی مہربانی ہے باجی! لیکن مجھے کاغذ کے تھیلے بنانے سے آپ نہ روکیں۔ ابّو کہا کرتے تھے کہ انسان کو ہمیشہ اپنی محنت کی روٹی کھانا چاہیے۔"

"تمہارے ابّو ٹھیک ہی کہا کرتے تھے۔ آج حالات نے تمہیں اتنی سی عمر میں مزدور بنا دیا ہے۔ بہرحال مزدوری بھی اپنے معیار اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق کرنی چاہیے۔ تم اگر چاہو تو لوور کے۔جی (LOWER.K.G) کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا سکتی ہو۔ ٹیوشن کا بندوبست میں کروں گی۔"

لیلیٰ نے خوش ہو کر کہا۔

"ہائے باجی! اگر بڑی کوٹھیوں میں ٹیوشن پڑھانے کا چانس مل جائے تو ہماری بہت سی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ سنا ہے کہ وہ لوگ بہت پیسے دیتے ہیں......"

ہیڈ مسٹریس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں، مجھ سے ایک بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ ان کے بچوں کے لیے کسی اچھے ٹیوٹر کا بندوبست کر دوں۔ ان کے چار بچے ہیں۔ تم پڑھاؤ گی تو ہر ماہ وہاں سے ڈیڑھ یا دو سو روپے مل جایا کریں گے۔"

لیلیٰ خوشی سے اچھل پڑی۔ اس نے ایک لمحہ تک بڑی عقیدت سے ہیڈ مسٹریس کو دیکھا۔ پھر یک بیک اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

"ارے، یہ کیا کرتی ہو" اس نے اسے اٹھا کر پھر سینے سے لگا لیا۔

لیلیٰ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو چھلکنے لگے تھے۔ وہ ہیڈ مسٹریس کی ممتا بھری چھاتیوں سے لگی ہوئی کہنے لگی۔

"باجی! ابو کے مرنے کے بعد ہم نے آج تک اکھٹے سو روپے کبھی نہیں دیکھے کیا واقعی، وہاں سے ڈیڑھ دو سو روپے مل جائیں گے۔"

اس نے پیار سے لیلیٰ کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"ہاں میری گڑیا! تمہاری جیسی ذہین لڑکی کو یقیناً ملیں گے۔"

"بیگم بھٹی اچھی صلاحیتوں کی قدر کرتی ہیں۔ میں آج ہی ان سے بات کرونگی"

"آپ کتنی اچھی ہیں باجی! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی"

پھر اس نے اپنی باجی سے الگ ہو کر کہا۔

"میں ابھی جا کر اپنی امی کو یہ خوشخبری سناتی ہوں۔ ان سے کہوں گی کہ اب کسی کے ہاں جا کر خادماؤں کی طرح روٹیاں پکانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے "خدا حافظ" کہتے ہوئے اپنی کتابیں اٹھائیں اور خوشی سے اچھلتی کودتی آفس سے باہر آ گئی۔

اسکول کی چھٹی بہت ہی پہلے ہو گئی تھی۔ اس کی دوسری سہیلیاں جو ایک ہی محلے میں رہتی تھیں۔ اس کا انتظار کر کے جا چکی تھیں۔

وہ بس سٹاپ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

نسیمہ اسے سمجھایا کرتی تھی کہ ہمیشہ لڑکیوں کے ساتھ مل جل کر آیا جایا کرو۔ اسے اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ کوئی لیلیٰ کو بچی سمجھ کر بہلا پھسلا کر لے جائے گا اندیشہ محض اس بات کا تھا کہ لیلیٰ اب بچی نہیں رہی تھی...... بچپن کی دہلیز کو بڑی خاموشی سے پھلانگ چکی تھی..... دیکھنے والے اس خاموش تبدیلی کو اس لیے محسوس نہیں کر سکتے تھے کہ وہ چھوٹے سے قد کی ایک دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ لیکن ماں نے اس کی ہر ڈھکی چھپی تبدیلی کو جان لیا تھا۔ اس لیے اسے ہمیشہ اس بات کا خدشہ رہتا تھا کہ کوئی بدمعاش اس کی کلائی کی طرح اس کی بیٹی کی کلائی کو بھی نہ پکڑ لے۔

لڑکیوں کا جوان ہونا کوئی عیب نہیں ہے لیکن بازاری انداز میں ان کی

کلائیاں پکڑ کر انہیں جوانی کا احساس دلانا سب سے بڑا عیب ہے۔

بس آئی اور وہ اس میں سوار ہو کر اپنے گھر تک بخیریت پہنچ گئی.....

لیکن گھر میں ماں نہیں تھی۔

اس کے ماتھے پر شکنیں پھیل گئیں اور وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے کمرے میں لالٹین روشن کی اور باہر آ کر دوبارہ دروازے میں تالا لگا دیا۔ اسے یقین تھا کہ ماں کو کسی وجہ سے خدا بخش کی کوٹھی میں دیر ہو گئی ہے اور اب وہ اندھیرے میں اکیلی گھر تک نہیں آ سکے گی۔ لہٰذا وہ خود ہی ماں کو واپس لانے کے لیے خدا بخش کی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔

کوٹھی کے آس پاس اندھیرا تھا۔ لیکن مین گیٹ کا اونگھتا ہوا بلب کسی بیمار کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔... لیلیٰ ایک بیک ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

بیمار بلب کی روشنی میں اسے بابے کا بھیانک چہرہ نظر آ رہا تھا۔

اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مین گیٹ پر اس کی موجودگی کا مطلب یہی تھا کہ وہ پھر اس کی ماں کو پریشان کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ کسی دوسرے ارادے سے بھی وہاں کھڑا ہوا ہے تو پھر بھی لیلیٰ نے یہی سوچا۔ "کم از کم ماں کو یہ خبر ہو جانا چاہیے کہ دشمن دروازے پر ہے لہٰذا وہ کوٹھی سے باہر نہ نکلے....."

وہ ماں کو ملنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ وہ جلد سے جلد ماں کو خطرے سے باخبر کر دے اور بتا دے کہ بابے کوٹھی کے باہر کھڑا ہوا ہے۔

کوٹھی کے چاروں طرف باؤنڈری وال کی بجائے مالتی کی گھنی جھاڑیاں تھیں جن کی اچھی طرح حفاظت نہ ہونے کے باعث وہ کئی جگہ سے مرجھا کر بیٹھ گئی تھیں.....

بابے دور اندھیرے میں کھڑی ہوئی لیلیٰ کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ پھاٹک سے ٹیک لگائے سگریٹ کے کش لیے جا رہا تھا۔

لیلیٰ جھاڑیوں کے ٹوٹے ہوئے حصے سے اندر داخل ہو گئی۔

وہ یہاں پہلے بھی ایک آدھ بار ماں کے ساتھ آ چکی تھی۔

سامنے والے دروازے کے علاوہ اسے کوٹھی کے پیچھے کچن سے جانے کا راستہ بھی معلوم تھا۔ اس لیے وہ بابے کی نظروں سے بچتی ہوئی کچن کے راستے سے کوٹھی کے اندر داخل ہو گئی۔

وہاں چولہے پر سالن کی ہانڈی چڑھی ہوئی تھی اور گوشت کے جلنے کی بُو پھیل رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی چولہے پر سے ہانڈی اتار دی۔ اس کی ماں چولہے ہانڈی کے کام میں کبھی غفلت سے کام نہیں لیتی تھی۔ لیکن آج وہ حیران تھی کہ ماں جلتی ہوئی ہانڈی چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہے؟

اسے تلاش کرنے کے لیے وہ کاریڈور کی طرف کا دروازہ کھول کر آگے بڑھ گئی۔۔۔۔۔۔ دور کسی کمرے سے اس کی ماں کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ آواز کی سمت بڑھنے لگی۔

ایک کمرے سے دوسرا کمرہ۔۔۔ دوسرے کمرے سے تیسرا کمرہ۔۔ ہر کمرے کے بعد ماں کی آواز واضح ہوتی جا رہی تھی۔

آپ کو۔۔۔۔۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے۔۔۔۔ شرم آنی چاہیے۔۔۔

اس کی آواز میں غصہ بھی تھا، خوف بھی تھا اور عاجزی بھی۔۔۔۔

آپ کے بھی بیوی بچے ہیں۔ جیسی ان کی عزت ہے۔ ویسی ہی ہم غریبوں کی بھی عزت ہے۔

پھر اس کی آواز پر خدا بخش کی آواز حاوی ہو گئی۔

"بے شک تمہاری بھی عزت ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی لوگ تمہیں اسی طرح عزت دار سمجھیں گے جس طرح مجھے سمجھتے ہیں۔ دو گھڑی عیش و عشرت میں گزر جائیں تو دنیا والوں کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اس چار دیواری میں ہم نے کیا کیا ہے۔۔۔

لیلیٰ کاریڈور سے گزرتی ہوئی ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پاس آ کر ٹھٹھک گئی۔ ڈرائنگ روم میں اس کی ماں سہمی ہوئی پیچھے ہی پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اور خدا بخش آہستہ آہستہ ایک شکاری کی طرح اس کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں۔ ایسی جھوٹی عزت پر۔۔۔"

نسیمہ نے غصہ سے کہا: "اگر آپ نے کوئی زیادتی کی تو میں چیخنا شروع کر دوں گی!"

خدا بخش کے قدم رک گئے۔ اس نے قدرے سست پڑتے ہوئے بڑی ہی مکّاری سے کہا۔۔

"اچھی بات ہے۔۔۔۔ اگر میں بُرا آدمی ہوں تو پھر کوٹھی سے باہر جا کر دیکھ لو، مجھ سے بھی زیادہ بُرے لوگ ملیں گے!"

نسیمہ اس کی باتوں کو نہ سمجھ سکی۔ اپنے ڈوپٹے کو سنبھالتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر جانے کے لیے اس کی طرف سے پلٹ گئی۔

اسی وقت لیلیٰ "امی" کہتی ہوئی بھاگ کر دروازے پر آ گئی۔

"میری بچی۔۔۔۔۔؟"

نسیمہ آگے بڑھ کر بیٹی سے یوں لپٹ گئی جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔۔

یلیٰ نے ماں کو خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”امی۔۔۔۔۔! باہر مت جائیے۔۔۔۔۔۔ وہ بدمعاش بلے کھڑا ہوا ہے

بابے۔۔۔۔۔!“ نسیمہ نے سہم کر خدابخش کو دیکھا۔

وہ لاپرواہی سے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

وہ سہمے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ بابے مجھے پریشان نہیں کرے گا۔۔۔ پھر وہ یہاں کیسے آگیا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ تم خود ہی سمجھدار ہو۔ جب تک عورت کسی ایک کی ہو کر نہ رہے۔ اس وقت تک لوگ اسی طرح اس پہ جھپٹتے ہیں۔“

وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میری ہو جاؤ۔ پھر کوئی تم پہ انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔“

وہ قریب پہنچتے ہی پھر ایک بار جھپٹ پڑا اور اس کی کلائی پکڑ لی۔

”چھوڑ دو میرا ہاتھ۔۔“

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

خدابخش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہر شخص اپنی نیکی کا بدلہ چاہتا ہے۔ اس غنڈے سے بچا کر جو نیکی میں تمہارے ساتھ کر رہا ہوں۔ تو کیا اس کے بدلے تم مجھے خوش نہیں کرو گی؟“

یلیٰ اپنی ماں کو اس کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے آگے بڑھی۔ مگر اس وقت تک نسیمہ نے پوری قوت سے اپنا بازو چھڑا کر اسے دھکا دے دیا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا دو قدم پیچھے چلا گیا۔ دراصل وہ نسیمہ کے دھکا دینے کی وجہ سے نہیں، بلکہ شراب کے نشہ کی وجہ سے لڑکھڑا گیا تھا۔

نسیمہ نے غصہ سے سرخ ہو کر کہا۔

”گناہ آخر گناہ ہے۔ میں ایسی نیکی نہیں چاہتی جو مجھے تباہی کی طرف لے جاتے۔“

خدابخش اس کی جانب ہاتھ اٹھا کر تنبیہ کرنے لگا۔

”سوچ لو۔۔۔۔۔ ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف وہ غنڈہ۔۔۔ دونوں میں سے کسی ایک کے پہلو میں تمہیں جانا ہی ہوگا۔“

اس نے آگے بڑھتے ہوئے بازاری انداز میں کہا۔

فیصلہ کر لو۔ میری جان! کہ تمہیں کس کی آغوش پسند ہے۔۔۔۔ اس غنڈہ کی۔۔۔۔ یا مجھ جیسے شریف آدمی کی۔۔۔۔

نسیمہ، یلیٰ کا ہاتھ تھامے پیچھے ہٹنے لگی۔

”میں اپنی جان دے دوں گی۔ لیکن تم دونوں کے ناپاک ارادوں کو کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔“

”تو پھر میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم کتنے پانی میں ہو۔۔۔۔۔۔ سیدھی انگلی سے کبھی گھی نہیں نکلتا۔۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اچانک اس کی طرف لپکا۔

لیکن نسیمہ کترا کر ایک طرف نکل گئی۔

قریب ہی صوفوں کے درمیانی میز پر ایک ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ نسیمہ نے فوراً ہی وہ لیمپ اٹھا کر اس پر حملہ کر دیا۔

نازک ہاتھوں کے حملے میں زور ہی کتنا ہوتا ہے؟ خدابخش نے لیمپ کو پکڑ لیا اور جھٹکے دے کر نسیمہ کے ہاتھ سے اسے چھڑانے لگا۔

دو تین جھٹکوں میں ہی لیمپ نسیمہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر لیمپ کا تار اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ خدا بخش نے تار کو بھی ایک جھٹکے سے چھڑانا چاہا۔۔۔۔۔ دونوں کے درمیان تھوڑی سی کش مکش ہوئی۔ پھر وہ تار لیمپ سے اکھڑ کر نسیمہ کے ہاتھ میں رہ گیا۔

خدا بخش نے قہقہہ لگاتے ہوئے لیمپ کو صوفہ پر پھینک دیا۔ لیلی گم صم کھڑی ہوئی تیزی سے سوچ رہی تھی کہ اسے کس طرح ماں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔۔۔۔۔ اسی وقت نسیمہ نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خالی تار کو جھنجھلا کر پھینک دیا۔

تار اچھل کر لیلی کے پاس آیا اور اسے چھو کر گذر گیا۔ لیلی ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

لیمپ سے تار اکھڑنے کے باعث اس کے سرے سے پلاسٹک کا خول ہٹ گیا تھا جس کی وجہ سے لیلی کو بجلی کا شاک پہنچا تھا۔

بیٹی کی چیخ سن کر نسیمہ گھبراہٹ میں اس کی طرف بھاگتی ہوئی آئی لیکن اس سے پہلے ہی خدا بخش نے اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔

"شیطان۔۔۔۔۔ کمینے۔۔۔۔۔!"

وہ نازک ہاتھوں سے اسے مکے مارنے لگی۔ اور خود کو چھڑانے کی کوششیں کرنے لگی۔

لیکن شیطان کی شیطانی قوت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے یہ خیال نہ آیا کہ وہ ایک بیٹی کے سامنے ماں کی توہین کر رہا ہے۔

ایک بار وہ نسیمہ کے چہرے کی طرف جھکا تو نسیمہ نے اپنے سر سے ایک زور کی ٹکر ماردی۔۔۔۔۔ ٹکر اس کی ناک پہ لگی تھی وہ بلبلا کر رہ گیا۔ نسیمہ موقعہ سے فائدہ

اٹھا کر ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔

لیکن اس سے دور ہو کر وہ کہاں جا سکتی تھی؟

باہر دوسرا شیطان کھڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔!

وہ شش و پنج میں رہ گئی۔ اس وقت تک خدا بخش پھر اس کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ایک قدم۔۔۔۔۔ دو قدم۔۔۔۔۔ وہ قدم قدم قریب پہنچ رہا تھا۔

نسیمہ سہم کر دیوار سے جا لگی۔

خدا بخش نے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ پھر وہ قہقہہ اچانک ہی ایک چیخ میں بدل گیا اور وہ اچھل کر ایک طرف گیا۔

اسے بجلی کا شاک پہنچا تھا۔

لیلی اپنے ہاتھ میں لیمپ کا اکھڑا ہوا تار لیے ماں کے سامنے آئی اور ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی۔

"ہمت ہے تو اب میری ماں کے پاس آؤ۔۔۔۔۔!"

وہ خدا بخش کو للکارنے لگی۔

اس وقت تک نسیمہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی تھی کہ لیلی نے اسے بجلی کا شاک دیا ہے۔

جس تار کو اس نے بے کار سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ اسے بیٹی نے کارآمد بنا دیا ہے۔

بات سمجھ میں آتے ہی نسیمہ نے تار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور لیلی کو اپنے ساتھ لیتی ہوئی سوئچ بورڈ کے پاس آ گئی۔ تاکہ خدا بخش سوئچ آف نہ کرنے پائے۔

خدا بخش حیرت اور جھنجھلاہٹ سے دونوں ماں بیٹی کو دیکھتا رہ گیا۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہاتھ بھر کی چھوکری اتنی ذہانت سے کام لے کر اپنی ماں کی حفاظت کرے گی۔

اس نے سوئچ بورڈ کی طرف دیکھ کر جھنجھلاتے ہوئے نسیمہ سے کہا۔

"تم تمام زندگی وہاں کھڑی نہیں رہ سکتیں...... بہتر ہے کہ اس وقتی سہارے کو چھوڑ دو اور میرے پاس آجاؤ۔"

"جب تک میری عزت یہاں محفوظ رہے گی۔ میں کھڑی رہوں گی....."

پھر وہ لہجے میں سختی پیدا کرتی ہوئی بولی۔

"اور یاد رکھو..... تمہیں بھی سمجھائے دیتی ہوں۔ اگر تم نے اس دروازے سے باہر جانے کی کوشش کی تو پھر تمہیں بجلی کا جھٹکا لگے گا......"

وہ دانت پیستے ہوئے غرا کر اسے دیکھنے لگا۔

بجلی کا وہ تار اتنا لمبا تھا کہ اگر وہ کھڑکیاں کھول کر بھی باہر کی طرف بھاگنا چاہتا تو نسیمہ اسے شاک پہنچانے کے لیے وہاں پہنچ جاتی۔

وہ بے بسی کی حالت میں اسی طرح کھڑا رہا اور دونوں ماں بیٹی کو گھورتا رہا۔

عورت محض کمزور ہونے کے باعث اپنی مدافعت نہیں کر سکتی... اگر اس کے ہاتھوں میں بھی طلسمی قوت آجائے تو وہ بڑی سے بڑی شیطانی قوتوں کے سامنے اپنی حفاظت کے لیے ڈٹ جاتی۔

خدا بخش ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اس ننگے تار کو دیکھ رہا تھا جو نسیمہ کے ہاتھ میں ایک طلسمی ہتھیار بن کر آگیا تھا۔

لیلی نے اپنی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"امی..... !" میں باہر جا کر کسی کو مدد کے لیے بلاتی ہوں۔"

نسیمہ نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بیٹی...... باہر وہ غنڈہ کھڑا ہوا ہے۔ اگر اس نے تمہیں دیکھ لیا تو ایک نئی مصیبت آجائے گی۔"

اس نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

"کوئی مصیبت نہیں آئے گی امی..... میں یہاں سے نکلنے کا ایسا راستہ جانتی ہوں کہ اس بدمعاش کو خبر تک نہ ہو گی۔

یہ کہتی ہوئی وہ جانے کے لیے دروازے کی جانب پلٹ گئی

اسی وقت باہر سے کسی کار کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ کوٹھی کے پورچ میں آکر رکی تھی۔

"ٹھہرو..... !" نسیمہ نے بیٹی کو روکنا چاہا۔

"نہیں امی..... یہ اچھا موقعہ ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ کون آیا ہے۔"

پھر وہ ماں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوڑتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی

خدا بخش کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں اس وقت کار میں کون آ پہنچا ہے۔؟

"بہرحال کوئی بھی ہو...... ؟

اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے..... ؟ نسیمہ اس کی ملازمہ ہے..... وہ بڑی

آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ یہ ملازمہ چوری کر رہی تھی۔ پکڑی جانے پر بجلی کا تار اس پر حملہ کرنے لگی ہے......"

وہ دل ہی دل میں سازشوں کا تانا بانا بننے لگا اور بار بار دروازہ دیکھنے لگا۔

لیکن ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔

شاید بیلی آنے والے کے سامنے اپنی ماں کا دکھڑا رو رہی ہوگی۔

خدا بخش اس چھوکری کے متعلق سوچنے لگا...... کمبخت بہت چالاک لڑکی ہے...... نسیمہ سے ٹیبل لیمپ چھینتے وقت خود اسے خیال آیا تھا کہ وہ بجلی کا تار ماں بیٹی کے لیے ایک زبردست ہتھیار بن جائے گا

وہ سوچتے سوچتے چونک پڑا۔

کسی کے قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔

آواز مردانہ جوتوں کی نہیں تھی۔ کاریڈور کے چکنے فرش پر اونچی ایڑی سینڈل کھٹ پٹ کر رہے تھے

پھر دوسرے ہی لمحے دروازے پر ایک لحیم شحیم عورت نظر آئی...

اونچا قد... بھاری بدن اور مردوں کی طرح چوڑی کلائیاں......!

دیکھتے ہی خدا بخش کا خون خشک ہوگیا۔

وہ اس کی بیوی تھی۔

بیوی کی دائیں طرف اس کا جوان بیٹا کھڑا ہوا تھا۔ جس کی عمر کوئی اٹھا بیس برس کی ہوگی...... اس کی بائیں طرف بیلی کھڑی ہوئی تھی۔

عورت نے ایک نظر نسیمہ پر ڈالی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تار پھر اپنے بیٹے سے کہا۔

"عاصم...... ! تم اس لڑکی کو لے کر اپنے کمرے میں جاؤ۔!"

"لیکن...... !" بیلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا "امی بھی میرے ساتھ جائیں گی"

عورت نے نسیمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں...... ! یہی مناسب ہے۔ تم بھی یہاں سے جاؤ.....!"

نسیمہ نے جان بچتی دیکھ کر بجلی کے تار کو پھینک دیا اور سر جھکا کر بیلی اور عاصم کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

ان کے جاتے ہی عورت نے دوپٹے کو اپنی کمر کے گرد اچھی طرح کس کر باندھتے ہوئے غصّہ سے پوچھا۔

"ہوں.... تو تم یہاں چیئرمین کے لیے الیکشن لڑ رہے ہو.....؟"

خدا بخش نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ن.... نہیں بیگم.... ! پہلے میری بات سن لو، یہ ملازمہ ایک نمبر کی چور ہے۔

"بکواس مت کرو...... !"

وہ چیختی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

"اگر وہ چور ہے تو تم نے اسے ملازم کیوں رکھا؟ کس سے پوچھ کر رکھا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ کہ میرے حکم کے بغیر اس گھر میں کوئی ملازمہ نہیں آئے گی.... کیا یہ کوٹھی تمہارے باپ کی ہے؟"

"نہیں...... اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔" تمہارے ابّا نے بنوا کر دی تھی..... !"

بیوی نے غرّاتے ہوئے پھر پوچھا۔

"اور وہ جو صابن کا کارخانہ تم چلا رہے ہو۔ وہ کس کا ہے.....؟"

وہ ...... وہ بھی تمہارے ابا کا ہے"

"اور یہ چیئرمین کا الیکشن تم کس کی دولت سے لڑ رہے ہو ......؟"

"تمہارے ابا کی دولت سے ......"

"اور یہاں جو تین وقت کی روٹیاں کھاتے ہو تو کس کی مہربانی سے ....

"تمہارے ابا کی مہربانیوں سے ....."

پھر اچانک ہی بیوی نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔

"میرے باپ کے ٹکڑوں پر پلتے ہو اور میرے ہی پیسے یہاں سوکن کر آتے ہو ......؟"

وہ اسے گردن سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی دیوار تک لائی اور اس کے سر کو ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دیوار سے ٹکرا دیا۔

خدا بخش کراہ رہ گیا۔

وہ ایسا کمزور نہیں تھا کہ ایک عورت سے مار کھا جاتا .... لیکن اس وقت اسے عورت نہیں اس کی دولت مار رہی تھی۔

اس کے سسر نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ خبردار! میری بیٹی پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ ورنہ پیسے پیسے کا محتاج کر دوں گا۔ اور لنگوٹی لگا کر کوٹھی سے نکال دوں گا۔

اس لیے وہ بیوی کے ہاتھ سے مار کھانے پر مجبور تھا۔

تھوڑی دیر تک چار دیواری میں بند ہو کر مار کھانا پڑتا تھا۔ پھر اس کے بعد وہی دولت ...... وہی کوٹھی ... اور وہی زندگی بھر کا عیش و آرام نصیب ہو جاتا .....

مار پیٹ کی آواز عاصم کے کمرے تک آرہی تھی۔

نسیمہ اور لیلیٰ گم صم بیٹھی ہوئی کبھی طمانچوں، آہوں اور کراہوں کی آوازیں سن رہی تھیں اور کبھی چیزوں کے اٹھا کر پٹخنے اور فرنیچر وغیرہ کے ٹوٹنے کی صدائیں سن رہی تھیں۔

نسیمہ نے پریشان ہو کر عاصم سے کہا۔

"اس ہنگامہ سے کیا فائدہ ......؟ تم اپنی والدہ کو جا کر سمجھاؤ ....."

عاصم نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جب تک امی کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔ انہیں کوئی سمجھا نہیں سکتا ..."

لیلیٰ نے نفرت سے گردن جھٹک کر کہا۔

"رہنے دیجئے امی ...... ! بُرے آدمی کو ایسی ہی سزا ملنی چاہئے۔ پیسے والے لوگ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتے"

عاصم نے ندامت کے احساس سے گردن جھکالی۔

"ابا جان نے ہماری گردن جھکادی ہے۔ مجھے کس قدر ندامت ہو رہی ہے یہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہاں مگر اتنی سی التجا کرتا ہوں کہ آپ ابا جان کی طرح ہمیں بھی برا نہ سمجھیں۔ تمام دولت مند ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

لیلیٰ کو اس کا ندامت آمیز لہجہ سن کر افسوس ہوا کہ وہ غصہ میں اسے بھی اپنی نفرت کا نشانہ بنا گئی ہے۔ نسیمہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹے ! ہم تمہیں برا نہیں سمجھتے۔ تم اور تمہاری امی بہت اچھی ہیں اگر وہ نہ آتیں تو ہمارا یہاں سے بچ کر نکلنا مشکل ہو جاتا۔"

اسی وقت عاصم کی ماں ڈرائنگ روم سے واپس آگئی۔ غصہ کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے مقابل پر زبردست حملے کرکے آرہی ہو۔ اس

کے ہاتھوں کی کئی چوڑیاں بھی ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔

وہ کمرے میں آئی اور ایک کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔

پھر ذرا سانس درست ہونے کے بعد اس نے نسیمہ سے پوچھا۔

"کیا تمہارا کوئی نہیں ہے کہ ملازمت کرنے یہاں چلی آئی تھیں؟"

"میرا کوئی سہارا ہوتا بہن! تو میں گھر سے کبھی قدم نہ نکالتی۔"

وہ دکھڑا سنانے لگی۔

"میں دو سال سے بیوگی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ خاوند کی بچائی ہوئی رقم سے اب تک گزارا ہوتا رہا۔ اب یہ بھی ختم ہو چکی ہے۔ تو بیلا کاغذ کے تھیلے بنا کر اور ٹیوشن پڑھا کر کچھ نہ کچھ رقم لے آتی ہے۔ ایک لڑکی تنہا کتنا بوجھ سنبھالے گی۔ اس لیے مجھے بھی مجبوراً کام دھندے کے لیے گھر سے نکلنا پڑا ہے۔"

بیلا اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے پاس آئی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی۔

"امی ...... ! اب آپ کو کسی کے ہاں ملازمہ بن کر نہیں رہنا پڑے گا۔ اب میں کام کروں گی۔ ہیڈ مسٹریس نے کہا ہے کہ مجھے ہر ماہ ڈیڑھ دو سو روپے مل جایا کریں گے۔"

نسیمہ، عاصم اور اس کی والدہ حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی سی لڑکی ڈیڑھ دو سو روپے ہر ماہ حاصل کر سکتی ہے۔

بیلا انہیں یقین دلانے کے لیے ہیڈ مسٹریس کی ساری باتیں بتانے لگی۔ کہ کس طرح اس کی تعلیمی قابلیت سے خوش ہو کر ہیڈ مسٹریس نے ایک دولت مند گھرانے میں ٹیوشن دلانے کا وعدہ کیا ہے۔

عاصم کی والدہ نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا واقعی تم کے، جی کے بچوں کو پڑھا سکتی ہو؟"

"جی ہاں ...... !" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ اسی سے اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اسکول کی ہیڈ مسٹریس اس معاملے میں میری سفارش کر رہی ہیں۔"

انہوں کی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پھر تو واقعی ہونہار ہو۔ مجھے بھی اپنے بچوں کے لیے تمہاری جیسی ہونہار ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔ اگلے سال عاصم میٹرک پاس کر لے گا۔ تو میں تمام بچوں کو لے کر یہاں آ جاؤں گی۔ عاصم کو یہاں کالج میں داخلہ مل جائے گا۔ اور بچے تمہارے پاس پڑھ لیا کریں گے۔"

عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی ...... ! اگلے سال تک کون کہاں رہے گا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم یہاں آئیں اور یہ لوگ اس محلے میں نہ رہیں۔"

"ہاں ...... ! یہ محلہ تو ہمیں چھوڑنا ہی ہوگا۔" نسیمہ نے کہا۔ "یہاں کے غنڈے بھی ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

عاصم کی والدہ نے نسیمہ کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے ......؟"

"نسیمہ ...... !"

"ہوں ...... !" انہوں نے کہا۔ "میں تمہیں ایک مناسب مشورہ دیتی ہوں۔ اگر تم اس پر عمل کرو گی تو پھر کوئی تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔"

نسیمہ نے احسان مندی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ضرور اس پر عمل کروں گی۔ آپ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

"تم شادی کرلو۔۔۔۔۔!"

"شادی۔۔۔۔۔؟" وہ گھبراسی گئی۔

عاصم کی والدہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

تم جوان ہو اور خوبصورت بھی ہو۔ اگر تم کسی شریف آدمی کی پناہ میں نہیں رہو گی تو قدم قدم پر تمہیں لوٹنے والے ملیں گے۔"

نسیمہ نے شرماتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔

"لیکن۔۔۔۔۔ لیکن یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اب دو چار سال میں مجھے بیٹی کی فکر کرنی ہو گی۔ ایسی صورت میں اپنے متعلق سوچتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔"

عاصم کی والدہ بغور اس کا جائزہ لے رہی تھی اور دل ہی دل میں یہ تسلیم کر رہی تھی کہ یہ عورت واقعی شریف ہے۔ شادی ہو گئی۔ ایک جوان بیٹی کی ماں بن گئی۔ بیوہ ہو گئی۔ پھر بھی دوسری شادی کے ذکر سے شرماتی ہے۔

انہوں نے بڑی محبت سے کہا۔

"میں نے ایک مشورہ دیا ہے۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں ہے تو ان غنڈوں سے پیچھا چھڑانے کا دوسرا راستہ یہی ہے کہ تم یہ محلہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلی جاؤ۔ ان لوگوں کو پتہ ہی نہ چلنے دو کہ تم کہاں چلی گئی ہو۔"

نسیمہ نے جواب دیا۔

ہاں یہی میں سوچ رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے محلے میں ہمیں سکون سے رہنے کا موقع مل جائے۔

پھر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بہن! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس وقت بابے سے کس طرح سے

پیچھا چھڑاؤں۔ وہ یقیناً ہماری تاک میں کہیں کھڑا ہو گا۔"

انہوں نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں ایک ہفتہ تک یہاں رہوں گی۔ اس وقت تک تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ اس عرصہ میں تم کسی دوسری جگہ مکان تلاش کر لینا۔

اب رہ گیا اس غنڈہ کا معاملہ تو آج کی رات تم یہاں میرے پاس رہو۔ کل صبح میں تھانہ میں اس غنڈے کو بلا کر جوتے ماروں گی۔"

نسیمہ احسان مندی سے اس عورت کو دیکھنے لگی اور دل ہی دل میں اپنا اور اس عورت کا موازنہ کرنے لگی۔

دونوں ہی عورتیں تھیں۔۔۔۔۔ لیکن ایک کمزور تھی اور دوسری شہ زور۔ نسیمہ گھر کی چار دیواری میں بیٹھی اب تک یہی سنتی آئی تھی کہ عورت کمزور ہوتی ہے مگر آج اس نے اس عورت کو ایک مرد سے لڑتے دیکھا تھا۔ وہ بابے جیسے غنڈے کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ تھانہ میں اسے بلا کر جوتے لگوا سکتی ہے۔

"وہ حیران تھی کہ ایک عورت ایسی جابر، ایسی حاکم اور ایسی شہ زور کیسے بن گئی۔۔۔۔۔"

یہ نکتہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب دولت کے کھیل تماشے ہیں۔ نہ مرد شہ زور ہوتا ہے اور نہ عورت کمزور ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں چاندی چابک آجائے، وہی اپنے وقت کا خدا بن جاتا ہے۔

خدا بخش نے ایک عورت سے نہیں، چاندی کے چابک سے مار کھائی تھی۔

رات کو بڑی دیر تک لیلیٰ اور عاصم اپنے اسکولوں اور کتابوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

ان کی تعلیمی دلچسپیاں دیکھ کر عاصم کی والدہ نسیمہ کو لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

عاصم بڑھ بڑھ کر اپنی کتابیں اور ٹکٹوں کے البم دکھا رہا تھا۔ لیلیٰ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اللہ۔۔۔! آپ نے تو بہت سی ٹکٹیں جمع کر رکھی ہیں۔"

عاصم اس کی حیرت پر مسکرانے لگا۔

"یہ میری ہابی ہے۔۔۔۔ تمہاری ہابی کیا ہے؟"

لیلیٰ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"میں کاغذ کے تھیلے بناتی ہوں۔ اور انہیں دکانوں میں بیچ دیتی ہوں۔"

عاصم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ تو کوئی ہابی نہ ہوئی۔ ہابی تو اسے کہتے ہیں جو فرصت کے وقت خود کو مصروف رکھنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔"

"میں بھی تو خود کو مصروف رکھنے اور گھر کا خرچ پورا کرنے کے لئے تھیلے بناتی ہوں۔"

عاصم نے پھر ایک بار وضاحت کی۔

"اوہو۔۔۔۔ تم سمجھیں نہیں، ہابی ایک دلچسپ مصروفیت ہوتی ہے۔ تھیلے بنانا تو محنت مزدوری ہے۔"

لیلیٰ نے مایوسی سے جواب دیا۔

"پھر تو میری کوئی ہابی نہیں ہے۔ مجھے پڑھنے لکھنے اور تھیلے بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔۔۔۔ ہابی جیسی چیز آپ جیسے بڑے آدمیوں کے گھروں میں ہے۔"

عاصم اپنے البم کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں۔۔۔۔! تم نے ٹھیک کہا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایک ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے کئی کئی روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔"

"پھر بھی کتنے روپے؟"

عاصم نے لاپرواہی سے کہا۔

"کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ کبھی ایک ٹکٹ کے لیے دس روپے، کبھی پچاس روپے اور کبھی سو روپے سے بھی زیادہ۔۔۔۔ ویسے زیادہ تر مفت میں ہی حاصل ہو جاتی ہیں۔"

لیلیٰ کبھی اسے اور کبھی ٹکٹوں کے البم کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

عاصم نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم حیران کیوں ہو گئیں۔۔۔۔؟"

لیلیٰ نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

"اگر اتنے سارے روپے کسی غریب آدمی کو دے دیئے جائیں تو؟"

"آں۔۔۔۔!" عاصم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

اس سے آج تک کسی نے ایسا سوال نہیں کیا ہے۔

آج تک اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان غیر ضروری ٹکٹوں پر خرچ ہونے والی

رقم دوسرے ضرورت مندوں کے کام آسکتی ہے۔

وہ لیلیٰ کو دیکھتا رہ گیا۔

"سو کینڈل پاور کی روشنی میں اس لڑکی کا معصوم چہرہ بہت ہی بھلا لگ رہا تھا۔ عاصم کو اب احساس ہوا کہ اس کے سامنے ایک غریب اور محنت کش لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔

وہ سوچنے لگا۔۔۔۔۔۔ اگر واقعی وہ اپنی فضول خرچی روک کر ایسی غریب لڑکی کی مدد کرے تو وہ نہایت آسانی سے اپنی تعلیم مکمل کر سکتی ہے۔

اس نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ اگر میں اپنی فضول خرچی روک کر تمہاری مدد کروں تو۔۔۔۔۔۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ اور گھبرا کر کہنے لگی۔

"آ۔۔۔۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔۔۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ نہ جانے میرے منہ سے کیسے یہ بات نکل گئی۔"

عاصم ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"تم گھبرا کیوں رہی ہو۔۔۔۔؟ تم نے کوئی غلط بات تو نہیں کی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے دوسرے غریبوں کے متعلق بات کہی تھی۔ آپ۔۔۔۔ آپ خدا کے لیے پھر کبھی میری مدد کرنے کا خیال دل میں نہ لائیں۔۔۔۔"

اتنا کہہ کر اس نے عاصم کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اپنا دوپٹہ سنبھالتی وہاں سے جانے لگی۔

عاصم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"مگر۔۔۔۔ تم کہاں جا رہی ہو؟"

"امی کے پاس۔۔۔۔۔"

"لیکن ذرا سنو تو۔۔۔۔!"

لیکن عاصم کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔۔۔۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس چھوڑ کر بیٹھ گیا۔

"عجیب لڑکی ہے" اس کے دل نے کہا "مگر اچھی لڑکی ہے۔۔۔۔"

وہ اس کے متعلق سوچتا چلا گیا۔

اس سوچ کے دوران اس کا ایک ہاتھ البم پر رکھا ہوا تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ بے خیالی میں ٹکٹوں کو نوچتا جا رہا تھا۔

بستر پر سوتے وقت بھی بڑی دیر تک لیلیٰ کی اجلی صورت اس کی نگاہوں میں پھرتی رہی۔۔۔۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بار بار نگاہوں کے سامنے کیوں آ جاتی ہے؟ وہ کیوں بار بار اس کے متعلق سوچ رہا ہے۔؟

دوسری صبح لیلیٰ مکان تلاش کرنے جا رہی تھی۔

نسیمہ پچھلی رات کے واقعہ سے سہمی ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لیلیٰ اکیلی مکان کی تلاش میں بھٹکنے کے لیے جائے۔ عاصم کی والدہ نے کہا۔

"ٹھیک تو ہے۔ اکیلی تم کہاں بھٹکتی پھرو گی۔ تم یہاں رہو۔۔۔۔ عاصم جا کر کوئی نہ کوئی مکان ڈھونڈے گا۔"

عاصم مسکرا کر کہنے لگا۔

"آل رائٹ امی۔۔۔۔ میں ضرور جاؤں گا۔ لیکن اکیلے نہیں۔۔۔۔ لیلیٰ اور

ان کی امی کو بھی ساتھ چلنا چاہیئے۔"

"میں تو نہیں جاؤں گی بیٹا..... !" تسنیمہ نے کہا "مجھے تو اس غنڈے کے خیال سے ہی وحشت ہوتی ہے۔"

عاصم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"کسی نہ کسی کو تو ساتھ چلنا ہی ہوگا، کیونکہ آپ کس قسم کے مکان میں رہنا چاہتی ہیں۔ یہ آپ مجھ سے بہتر سمجھتی ہیں...... مثلاً مکان کچا ہوگا یا پکا...... چھوٹا ہوگا یا بڑا...... سستا ہوگا یا مہنگا...... محلے اور پڑوس والے آپ کے ہم مزاج ہیں یا نہیں... اس کا فیصلہ آپ دونوں ہی کرسکتی ہیں۔"

عاصم کی والدہ بیٹے کی تائید کرنے لگیں۔

"ہاں...... جتنی چادر ہو اتنا ہی پاؤں پھیلانا چاہیئے۔ عاصم اکیلا جائے گا تو کوئی مہنگا ہی مکان دیکھ کر آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ لیلیٰ ساتھ چلی جائے۔"

لیلیٰ ہچکچائی کہ عاصم کو اس غلط فہمی میں کیوں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ امداد کی طلب گار ہے۔

وہ عاصم سے نظریں چرا رہی تھی۔

"بہت اچھا امی..... ! تو پھر میں ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤں؟"

ماں نے اسے اجازت دے دی۔

ڈرائیور حکم سن کر گیراج سے کار نکالنے لگا۔

لیلیٰ کو الجھن سی ہو رہی تھی۔ اس نے عاصم کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے

"آپ تنہا کیوں نہیں چلے جاتے.....؟"

"میرا ساتھ آپ کو ناگوار گذرتا ہے۔ تو یونہی سہی......"

وہ پھر الجھ گئی۔

"اللہ...... ! میں نے کب یہ کہا ہے کہ ناگوار گذرتا ہے۔ آپ تو ہر بات کو غلط سمجھنے لگتے ہیں۔"

"ہاں، یہ سچ ہے لیکن پھر جلد ہی اپنی غلطی کو محسوس کر لیتا ہوں۔"

عاصم مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"رات میں بڑی دیر تک تمہاری بات پر غور کرتا رہا۔ اس وقت مجھے اپنے گاؤں کی ایک بڑھیا کا خیال آگیا۔ اس کی ایک جوان بیٹی ہے۔ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ وہ بیچاری اپنی لڑکی کی شادی بھی نہیں کرسکتی ہے اگر میں اسے دو چار سو روپے دے دوں تو بڑی آسانی سے اس کی شادی ہو جائے گی۔"

لیلیٰ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ اس نے خوش ہوکر کہا۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔ میں دراصل یہی کہنا چاہتی تھی کہ جو مجبور ہوں مفلوج اور کام کرنے کے قابل نہ ہوں۔ ان کی مدد ہر پیسے والے کو کرنا چاہیئے۔"

عاصم نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر پوچھا۔

"تو پھر تم میرے ساتھ چل رہی ہو.....؟"

وہ مسکراتی ہوئی اندر بیٹھ گئی۔

عاصم کار کی پچھلی طرف سے گھوم کر آیا اور دوسرا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار چل پڑی.....

اپنے محلے سے نکل کر عاصم نے دوسرے محلے میں کار روکنے کے لیے کہا لیلیٰ نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں نہیں..... ہم اپنے محلے سے بہت دور رہیں گے تاکہ بالے

ہمارا سایہ تک نہ دیکھ سکے۔"

"ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

اس نے ڈرائیور سے آگے چلنے کے لیے کہا۔

کار پھر چل پڑی......

ایک محلے میں پہنچ کر انہوں نے دو تین مکانوں کو دیکھا۔ لیکن ان کا کرایہ اتنا تھا کہ سنتے ہی بیلی کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بیچاری جو کچھ ٹیوشن سے کما کر لاتی وہ سب کا سب مالک مکان کی جیب میں چلا جاتا۔

بیلی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ہمیں کسی پسماندہ علاقہ میں چلنا چاہیئے۔ وہاں کچے مکانات کا کرایہ کم ہو گا۔"

عاصم نے جواباً کہا۔

"پسماندہ علاقوں میں شہری زندگی کی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔ تمہاری جیسی لڑکی کو کسی صاف ستھرے محلے میں رہنا چاہیئے۔"

وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"کیوں...... مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

عاصم اس کے سوال سے گڑبڑا گیا۔ ایک ساعت کے لیے دونوں کی نظریں ملیں...... اور جھک گئیں۔

بیلی سے اگر نظریں جھکنے کا سبب پوچھا جاتا تو شاید وہ اس کی وضاحت نہ کر سکتی...... وہ گڑیا جیسی لڑکی ابھی بچپن کی طرف سے کروٹ بدل کر جوانی کی طرف رخ پھیر رہی تھی۔ ابھی وہ اس عمر کے احساسات اور جذبات کو اچھی طرح نہیں سمجھتی تھی...... اس لیے وہ خود ہی اچھی طرح نہیں سمجھ سکی کہ

یکایک نظریں کیوں جھک گئیں۔

عاصم کی نظریں اسکے سوال سے الجھ کر جھک گئی تھیں۔ اس نے پوچھا تھا

"مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے...... ؟"

کوئی خاص بات تو ضرور ہے... عاصم کے دل نے کہا۔

ورنہ لڑکیاں تو بہت سی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ وہ کبھی کسی مکان کی تلاش میں یا کسی منزل کی تلاش میں نہیں گیا۔

لڑکیاں تو بہت سی ہیں۔ لیکن ان کی طرف اس نے کبھی اس طرح نہیں دیکھا جس طرح بار بار چور نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے...... خدا جانے کیا بات ہے کہ وہ اچھی لگتی ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اچھی لگتی ہے۔

وہ بیلی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیلی...... پتہ نہیں تم میں کون سی خاص بات ہے۔ میرا دل کہتا ہے تمہیں اچھے محلے میں رہنا چاہیئے۔ ایک اچھے مکان میں رہنا چاہیئے۔ ایک خوبصورت باغیچہ میں ٹہلنا چاہیئے۔ اور ہماری جیسی ایک قیمتی مرسڈیز کار میں گھومنا چاہیئے۔"

بیلی بے اختیار ہنسنے لگی۔

"آپ ایسے خواب نہ دکھائیں۔ کوا ہنس کی چال چلے تو خود اپنی بھی مصیبت ہو جاتی ہے۔ اب یہی دیکھئے ناکہ میں اتنی قیمتی کار میں بیٹھ کر مکان تلاش کر رہی ہوں۔ مکان دینے والے ماں بیٹی کی غربت کو دیکھ کر نہیں بلکہ کار کو دیکھ کر اپنے مکان کا کرایہ بتا رہے ہیں۔"

عاصم نے حیرت سے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"واقعی، میں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا تھا۔ مکان دینے والے تو

یہی سوچتے ہوں گے کہ جن کے پاس کار ہے وہ ایک کمرے کا کرایہ دو سو تک بھی دے سکتے ہیں!"

تو پھر کیا خیال ہے؟"

وہ کہنے لگی۔

"کیوں نہ ہم پیدل چلتے ہوئے مکان تلاش کریں......؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو تمہارے لیے سوچ رہا ہوں کہ کہاں پیدل چلتی رہو گی۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ پیدل ہی چل رہی ہوں.... اپنی بات کہیں......؟"

عاصم نے اس بات کے جواب میں ڈرائیور سے کہا۔

"تم گاڑی لے جاؤ۔ ہم ٹیکسی میں واپس آجائیں گے۔"

ڈرائیور انہیں سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

وہ دونوں سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

موسم بڑا ہی خوشگوار تھا۔

سرما کی خنک ہوائیں ان کے آس پاس سے اٹھلاتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ اور سڑک کے دونوں طرف پھولوں اور پتیوں سے لدے ہوئے درختوں کی شاخیں جھوم رہی تھیں۔

عاصم نے چلتے چلتے کئی بار کنکھیوں سے لیلیٰ کو دیکھا۔

وہ کاٹن کا چھاپ دار چھیرا اور کاٹن کی سفید شلوار پہنی ہوئی تھی۔ ایک سفید ڈوپٹہ نازک سے سینے پر پھیل کر اس کے شانوں پر سے ہوتا ہوا پشت کی طرف

اس کا لباس نہایت ہی معمولی سا تھا۔ لیکن اس معمولی لباس کے فریم میں جڑی ہوئی تصویر کی دلکشی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔

عاصم کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی طرح زندگی بھر اس کے ساتھ چلتا رہے۔ آج سے پہلے دل کبھی کسی ساتھی کے لیے نہیں مچلا تھا۔ یوں تو بہت سے لڑکے اور لڑکیوں سے اس کی قلمی دوستی تھی۔ لیکن اس طرح کی قلمی دوستی میں اتنی قربت نہیں ہوتی۔ جتنی کہ ابھی یہ لڑکی قریب آگئی تھی۔

ویسے اور بھی لڑکیاں تھیں جو آج سے پہلے اس کے قریب آئی تھیں۔ کبھی شادی بیاہ کی تقریبات میں ہنستے بولتے ہوئے اور کبھی اپنے گاؤں کی چاندنی راتوں میں ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے، وہ ان لڑکیوں کے ساتھ اپنا سارا بچپن گذار آیا تھا...... اب وہی لڑکیاں اس سے پردہ کرنے لگی تھیں.... اچھا ہے، پردہ کرتی رہیں۔ اس نے پلٹ کر کبھی ان کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا.... لیکن لیلیٰ بھی اس کی نگاہوں سے اسی طرح چھپ گئی تو کیا ہوگا؟

اس نے لیلیٰ کو دیکھتے ہوئے بیک سوال کیا۔

"تمہاری امی تمہیں پردہ کرنے کے لیے تو نہیں کہتیں....؟"

"ہاں کہتی ہیں۔ جب سے میں نویں جماعت میں گئی ہوں تب سے پتہ نہیں کیوں، وہ مجھے بار بار گھورتی رہتی ہیں اور مجھے برقعہ پہننے کے لیے کہتی ہیں۔"

"تو پھر تم مجھ سے بھی پردہ کرنے لگو گی؟"

لیلیٰ کو یہ سوال کچھ عجیب سا لگا..... اس نے ہولے سے کہا۔

"پردے کے معنی یہی ہیں کہ ہر ایک سے پردہ کیا جائے۔"

عاصم سر جھکائے خاموش رہا۔

لیلیٰ تھوڑی دور تک چلتی ہوئی اس کی خاموشی کو محسوس کرتی رہی۔ پھر وہ

کہنے لگی۔

“آپ ایک ہفتے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ سے پردہ کرنے یا کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

عاصم نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور آہستگی سے پوچھا۔

“اگر میں نہ جاؤں تو۔۔۔۔؟”

وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔

“کیسے نہیں جائیں گے۔ آپ کی امی جو کہہ رہی ہیں۔”

امی کا فیصلہ میں بدل سکتا ہوں۔ میں ان کا سب سے لاڈلا بیٹا ہوں۔ جو کہتا ہوں، اسے وہ مان لیتی ہیں۔ میں اسکول سے ٹرانسفر سرٹیفکیٹ لا کر یہاں کے کسی اسکول میں داخلہ لے لوں گا۔”

وہ تعجب سے کہنے لگی۔

“اللہ ایک سال کی بات ہے۔ آپ یہاں آکر کالج میں داخلہ لیں گے پھر ابھی سے ٹرانسفر سرٹیفکیٹ لے کر آنا کہاں تک مناسب ہے؟”

“ہاں مناسب تو نہیں ہے۔ لیکن اب یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔”

کیوں۔۔۔۔؟”

عاصم نے سنجیدگی سے اس پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

“تم بہت اچھی لگتی ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ یہاں رہوں اور ہمیشہ تمہارے ساتھ اسی طرح چلتا رہوں۔

ببلی کو اس کی بات اچھی لگی۔۔۔۔۔۔ اس لیے اچھی لگی کہ اس بات سے اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا اپنا دل بھی یہی کہتا تھا کہ عاصم لڑکا ہے۔ اس نے عاصم کو ابھی جو پیدل چلنے کا مشورہ دیا تھا تو اس کے ذہن کسی گوشہ میں شاید یہی خواہش تھی کہ وہ اس اچھے لڑکے کے ساتھ تھوڑا سا اچھا وقت گذارنا چاہتی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی پسندیدگی کا اگر تجزیہ کرتے اور ایک دوسرے کے جذبوں کو سمجھنے کا سلیقہ رکھتے تو یقیناً ان کا دل بے اختیار دھڑکنے لگتا۔

لیکن ابھی ان کے دلوں نے اس انداز میں دھڑکنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ جو محبت کا گہرا اور انمٹ جذبہ ہوتا ہے۔ وہ جذبہ ابھی انہیں اوپر ہی اوپر سے چھو کر گذر رہا تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔

“آپ بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اتنے دولت مند ہو کر بھی میرے ساتھ پیدل چل رہے ہیں اور ہمارے لیے مکان تلاش کر رہے ہیں۔۔۔۔”

“اللہ توبہ ہے۔۔۔۔۔! ہم کب سے اسی طرح چل رہے ہیں۔ اس طرح مکان ملنے سے تو رہا۔۔۔۔”

“مین روڈ پر تو نہیں مل سکتا۔ چلو اس گلی کے اندر چل کر دیکھیں۔”

وہ دونوں ایک گلی کے اندر داخل ہو گئے۔

“ببلی۔۔۔۔”

“ہوں۔۔۔۔!”

“تم مجھے دولت مند نہ کہا کرو۔”

“پھر کیا کہوں۔۔۔۔۔؟”

“میرا نام عاصم ہے۔”

“وہ ہنسنے لگی۔

عاصم بھی اس کی سریلی اور کھنکتی ہوئی ہنسی کا ساتھ دینے لگا۔

وہ دونوں اسی طرح ہنستے بولتے ہوئے، ایک گلی سے دوسری گلی اور ایک مکان سے دوسرے مکان میں جھانکتے رہے۔ لیکن اس روز ایک بھی سستا کرائے کا مکان نظر نہیں آیا۔

تھک ہار کر وہ شام تک واپس آ گئے۔

عاصم کی والدہ نے بتایا کہ بالے نے تھانیدار کے سامنے کان پکڑ کر معافی مانگی ہے۔ آئندہ وہ کبھی نسیمہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

پھر بھی نسیمہ اس محلے میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔

غنڈوں کے معافیاں مانگنے اور قسمیں کھانے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ تو ہزار بار جیلوں میں جاتے ہیں۔ مار کھاتے ہیں، توبہ کرتے ہیں۔ پھر بھی گردی سے باز نہیں آتے۔ .... عاصم کی والدہ کے جانے کے بعد سکتا تھا کہ وہ پھر اپنی کمینگی پر اتر آئے۔

نسیمہ کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ عاصم کی والدہ نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ یہ محلہ چھوڑ ہی دینا چاہیے۔

دوسرے دن عاصم اور لیلیٰ پھر مکان تلاش کرنے کے لیے روانہ ہوئے دونوں میں یہ طے پایا کہ لیلیٰ پہلے اسکول جائے گی اور وہاں سے چھٹی کر عاصم کے ساتھ ہو جائے گی۔

لیکن اسکول میں ہیڈ مسٹریس نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ دو سو روپے ماہانہ پر ٹیوشن کی بات پکی ہو گئی ہے، بیگم بھٹی آج دو بجے آ کر اسے اپنے ساتھ جائیں گی۔ تاکہ وہ ان کی کوٹھی دیکھ لے۔

عاصم کو یہ سن کر خوشی بھی ہوئی اور مایوسی بھی۔ .... مایوسی اس یہ کہ آج لیلیٰ کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔

"پھر کب ملاقات ہو گی ..... ؟" اس نے پوچھا

"دو بجے تو میں بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤں گی۔ ایک دو گھنٹے کے بعد واپسی ہو گی۔"

"یعنی پانچ بجے کے بعد تم گھر میں رہو گی۔ ؟"

"ہاں ......"

"کہیں جاؤ گی تو نہیں ؟"

"نہیں ...... مجھے تو آپ کا شدت سے انتظار ہو گا۔"

"میرا انتظار ..... ؟" عاصم نے خوش ہو کر پوچھا۔

لیلیٰ نے معصومیت سے کہا۔

"ہاں ..... آپ مکان ملنے کی خوشخبری سنائیں گے نا ..... ؟"

"ہاں ضرور، لیکن تم نے اگر میرا انتظار نہ کیا تو میں مکان ملنے پر بھی یہی خبر سناؤں گا کہ مکان نہیں مل سکا۔"

لیلیٰ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔

"اگر آپ کہیں گے کہ نہیں مل سکا ہے تو میں پھر بھی یہی سمجھوں گی کہ مکان مل گیا ہے۔"

عاصم بھی اس کی بات پر ہنسنے لگا۔

وہ اسکول کے بڑے پھاٹک کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں ہنستے دیکھ کر ایک اسکول مسٹریس وہاں سے گزرتی ہوئی رک گئی۔

"لیلیٰ ...... اس نے سخت لہجے میں پکارا۔

"جی، باجی ..... ابھی آئی ....."

لیلیٰ نے جلدی سے عاصم کو کہا۔

"اچھا خدا حافظ...... شام کو ضرور خوشخبری سنائیے گا۔"

یہ کہتی ہوئی وہ باجی کے قریب آ گئی۔

عاصم اُسے بڑی چاہت سے اور بڑی لگن سے بار بار پلٹ کر دیکھتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔

اسکول کی باجی لیلیٰ کی طرح نادان نہیں تھی، وہ عاصم کی نگاہوں کو اچھی طرح پڑھ چکی تھی۔

"کون ہے یہ...... ؟" اس نے پوچھا۔

"عاصم صاحب...... ؟"

"کوئی صاحب بھی ہوں" اس نے ڈانٹ کر کہا "یہ اسکول ہے عشق کرنے کی جگہ نہیں ہے۔"

"عشق..... !" لیلیٰ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"اب اگر میں نے اس لڑکے کو یہاں دیکھ لیا تو تمہیں اسکول سے نکلوا دوں گی...... !"

یہ کہہ کر وہ غصہ میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی۔

وہ چلی تو گئی...... لیکن لیلیٰ کے ذہن میں ایک چنگاری چھوڑ گئی۔

عشق...... !

اچھا تو عاصم سے باتیں کرنا عشق ہے۔

اس کی باتوں کے جواب میں مسکرانا عشق ہے...

صبح کا وعدہ اور شام کی ملاقات عشق ہے...

عشق میں تو کوئی کسی کو چاہتا ہے...... لیلیٰ کے ذہن میں عاصم کی نظریں

واضح ہونے لگیں۔ ان نگاہوں میں کیسی چاہت اور کیسی گرمی تھی۔

لیلیٰ کا بدن تپنے لگا۔

عشق میں کسی کا انتظار بھی ہوتا ہے....

وہ خود ہی ابھی عاصم سے کہہ رہی تھی کہ مجھے آپ کا شدت سے انتظار ہوگا

"میرا انتظار...... !" عاصم کھل اٹھا تھا۔

محبوب کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ اس کی محبت اس کا..... اور صرف اس کا انتظار کرے۔

عشق میں کسی کو بار بار دیکھنے کی تڑپ ہوتی ہے.....

"پھر تو تم مجھ سے بھی پردہ کرنے لگو گی...... ؟"

عاصم کے اس سوال کے پیچھے مجھے دیکھتے رہنے کی کتنی تڑپ ہے۔

آہ..... غالب اور میر کی شاعری اسکول کی کتابوں سے نکل کر اپنی ساری تڑپ، سارا انتظار اور ساری کسک لیے اس دل پر دستک دے رہی تھی۔

اس نے گھبرا کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

زندگی میں پہلی بار....

ہاں..... زندگی میں پہلی بار اس معصوم لڑکی کا نازک سا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔

شام کو عاصم سے سامنا ہوا تو لیلیٰ کی عجیب حالت تھی۔

اسکول کی باجی نے اس کے سوچنے کے انداز کو ایکدم سے بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب عاصم کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک بھاری بھرکم شخصیت کا مالک ہے اور اپنی مردانہ نگاہوں سے، مردانہ مسکراہٹوں سے اور مردانہ قدوقامت سے اس کے حواس پر چھاتے جا رہا ہے۔

حالانکہ عاصم وہی پہلے جیسا عاصم تھا۔ لیکن سوچنے کا انداز بدل جائے تو دیکھنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ لیلیٰ کی نگاہیں وہی تھیں۔ لیکن ان نگاہوں میں عاصم کی تصویر بدل گئی تھی۔

عاصم اس وقت نسیمہ کو خوشخبری سنا رہا تھا۔

"مکان ایک اچھے محلے میں مل گیا ہے۔ وہاں کے لوگ بھی بات چیت سے اچھے ہی نظر آتے ہیں۔ مکان سے نکل کر دس قدم چلنے کے بعد، گلی سے مڑتے ہی بڑی سڑک آجاتی۔ ٹھیک وہیں پر بس اسٹاپ ہے۔ لیلیٰ کے لیے اسکول آنے جانے کی بڑی سہولت ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے لیلیٰ کی جانب دیکھا تو وہ گھبرا کر نظریں چرانے لگی۔

نسیمہ نے پوچھا۔

"مکان کا کرایہ کیا ہے۔"

"پچاس روپے۔۔۔۔۔"

نسیمہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ پچاس روپے اس کی اوقات سے زیادہ تھے۔

عاصم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اس سے کم میں تو کہیں بھی مکان نہیں ملے گا۔"

عاصم کی والدہ نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں تو یہ بھی سستا ہے۔ اب تو لیلیٰ ہر ماہ دو سو روپے لایا کرے گی۔ اس میں سے پچاس کرائے کے لیے نکال دیا کرنا۔۔۔"

پھر انہوں نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ارے ہاں، عاصم! تم نے لیلیٰ سے مٹھائی نہیں مانگی؟ آج اس کی ٹیوشن بھی ہو گئی ہے۔"

عاصم نے لیلیٰ کی جانب دیکھ کر جواب دیا۔

"مٹھائی کھلانے والے اگر خوشی کا اظہار کریں تو مٹھائی کھانے میں مزہ آتا ہے۔ آپ ذرا ان کا چہرہ دیکھیے امی۔۔۔۔۔ کیسی گھبرائی گھبرائی لگ رہی ہیں۔"

لیلیٰ نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں تو۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔"

عاصم کی والدہ نے مسکرا کر محبت سے کہا۔

"آج پہلی بار بچوں کو پڑھا کر آئی ہے۔ اس لیے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی ہے۔"

لیلیٰ نے ان کی باتوں کا سہارا لے کر کہا۔

"جی ہاں۔۔۔۔ یہی بات ہے۔۔۔۔"

نسیمہ مکان کی فکر میں الجھی ہوئی تھی۔ اس نے عاصم سے پوچھا۔

"تو ..... کل سے ہم اس مکان میں رہ سکتے ہیں ..... ؟"

"ضرور رہ سکتے ہیں۔ مالک مکان دو مہینے کا پیشگی کرایہ مانگ رہا تھا [illegible] نے ایک مہینہ کا کرایہ دے کر مکان کی چابی لے لی ہے۔"

لیلیٰ نے چونک کر عاصم سے پوچھا۔

"مکان کا کرایہ آپ نے کیوں دے دیا ..... ؟"

عاصم نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں محترمہ! آپ کسی کی مدد لینا پسند کرتی ہیں ..... آپ تنخواہ ملے گی تو میری رقم واپس کر دیجئے گا۔"

عاصم کی والدہ نے بیٹے سے پوچھا۔

"یہ کیا بات ہوئی ؟ تم لیلیٰ سے پچاس روپے واپس لو گے ؟"

"جی ہاں امی ..... لیلیٰ کا خیال ہے کہ جو بے بس اور مجبور ہوتے ہیں ان کی مدد کرنا چاہیئے ..... "

اس نے لیلیٰ کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی کو اپنا سمجھ کر مدد کرنے کا حق ہمیں نہیں ہے ..... "

اپنا سمجھ کر ..... " اچانک لیلیٰ کے دل میں ایک لہر سی پیدا ہوئی۔ عا
اپنا ہی سمجھ کر امداد کے بہانے اس کے قریب ہونا چاہتا ہے ..... وہ الجھن میں پڑ گئی ..... اگر امداد قبول کرتی ہے تو اپنی خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہے اگر امداد سے انکار کرتی ہے تو عاصم کو صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ اسے اپنا نہیں سمجھ

عاصم کی والدہ نے اپنے بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"لیلیٰ کا خیال بالکل غلط ہے۔ کیوں لیلیٰ ..... اگر میں تمہیں بیٹی سمجھ کر کروں تو کیا تم انکار کرو گی ؟"

لیلیٰ نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ..... میں آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتی ..... لیکن .. جب آپ مجھے بیٹی کہتی ہیں تو امی کی طرح مجھے سب سے پہلا سبق یہی سکھایئے کہ کسی سے مدد لیے بغیر اپنی مجبوریوں سے طرح لڑنا چاہیئے۔"

عاصم کی والدہ کو چپ سی لگ گئی۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھنے لگیں۔

اچانک ہی انہیں اپنی بیٹی یاد آنے لگی ..... وہ بھی کچھ ایسی ہی تھی کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا لیتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ لیلیٰ کی طرح ذہین نہیں تھی۔ انہیں لیلیٰ کو دیکھ کر بھی یقین کرنے کو جی نہیں کرتا تھا کہ اتنی سی لڑکی ایسی ذہانت کی باتیں اپنی زبان سے کر رہی ہے۔

لیکن آنکھوں دیکھی حقیقت کو وہ کیسے جھٹلا سکتی تھیں۔ اس رات کا واقعہ انہوں نے سنا تھا کہ اس نے کس طرح حاضر دماغی سے کام لے کر اپنی ماں کی عزت بچائی تھی ..... دو سو روپے ماہوار کی ٹیوشن بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ کتنی ذہین لڑکی ہے ..... در اصل اس کی ذہانت کو صرف اسکول کی کتابوں نے نہیں بنایا تھا ..... غربت افلاس اور زندگی کی تلخیوں نے بھی اس ذہانت کو جلا بخشی تھی۔

انہوں نے لیلیٰ کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ لڑکیوں کو تمہاری طرح خوددار ہونا چاہیئے ..... لیکن یہ خودداری ہر جگہ اچھی نہیں لگتی۔ تم نے اپنی ذہانت سے مجھے قائل کر دیا ہے۔ مگر میں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ اس لیے میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ جو کچھ میں کہوں اس پر خاموشی سے عمل کرو۔ کرو گی نا ؟"

ان کا انداز ایسا تحکمانہ تھا کہ لیلیٰ سمٹ کر رہ گئی۔

اسے وہ رات یاد آ گئی۔ جب بیگم صاحبہ نے اپنے بھاری بھر کم ہاتھوں سے اپنے خاوند کی مرمت کی تھی...... کیسی ڈیل ڈول والی عورت ہے جب حاکمانہ انداز اختیار کرتی ہے تو شیرنی کی طرح غراتی ہے۔

لیلیٰ کی طرح نسیمہ بھی دم سادھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس میں بھی اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ان کے حکم کے خلاف زبان ہلاتی...

انہوں نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"عاصم.... کل ان کا تمام سامان نئے مکان میں پہنچا دینا اور ایک مہینہ کا راشن بھی لے جا کر رکھ دینا۔ تاکہ تنخواہ ملنے سے پہلے انہیں کسی سے قرض لینے کی ضرورت نہ پڑے۔"

"اوہ.... امی! آپ کتنی گریٹ ہیں۔"

عاصم نے خوش ہو کر لیلیٰ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں محترمہ...... اب تمہارا کیا خیال ہے۔؟"

ماں نے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اب تم خواہ مخواہ اسے نہ چھیڑو..... جاؤ یہاں سے.. تم نے شام کی چائے پی لی ہے۔"

"جی نہیں.....!"

"میں تمہارے کمرے میں بھیج دیتی ہوں۔"

"او کے...."

وہ پنجوں پر گھوم کر مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد نسیمہ نے احسان مندی سے کہا۔

"میں آپ جیسی نیک دل خاتون کو کبھی بھلا نہ سکوں گی۔ آپ نے ہمارے لیے اتنا کیا ہے۔ جتنا کہ اپنے بھی کبھی نہ کرتے......!"

"میں نے تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔"

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے لیلیٰ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تو اپنی بیٹی کی خودداری سے مسکرا کر یہ تھوڑی سی نیکی کر رہی ہوں ادھر آؤ لیلیٰ!"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

عاصم کی والدہ کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے چینی تھی۔

انہوں نے بڑی محبت سے کہا۔

"یہاں بیٹھو......!"

وہ صوفہ پر ان کے قریب سمٹ کر بیٹھ گئی۔

"لیلیٰ.....!"

انہوں نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"کسی کی مدد نہ لینا اور اپنی ضرورتیں آپ پوری کر لینا بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن پھر بھی اس دنیا میں رہ کر انسان کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

"اگر کبھی اس قسم کا سہارا ملے تو یہ ضرور دیکھو کہ سہارا دینے والے کی نیت کیسی ہے۔ اگر وہ سہارے کے بدلے کوئی ایسا معاوضہ طلب کرتا ہے کہ جس سے خودداری کو ٹھیس پہنچتی ہو تو بلا جھجک اس سہارے کو ٹھکرا دو۔

میری بات سمجھ رہی ہو نا....؟"

لیلیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عاصم کی والدہ نے بڑی محبت سے اس کے گرد اپنی باہنیں حمائل کر دیں اور اسے اپنے سینے سے لگا کر نسیمہ سے کہا۔

"میری بھی ایک ایسی ہی بیٹی تھی......"

"اب کہاں ہے......؟" نسیمہ نے پوچھا۔

وہ فوراً ہی جواب نہ دے سکیں۔ لیلیٰ محسوس کر رہی تھی کہ ان کا بدن بھرے ہوئے کانپ رہا ہے۔ اور ان کی ممتا بھری چھاتیاں، جن پر اس کا سر ٹکا ہوا ہے۔ تیزی سے دھڑک رہی ہیں۔

ان کے دل سے ایک آہ نکلی۔

"وہ اللہ کو پیاری ہو گئی...... ہائے! میری گڑیا جیسی بیٹی...... میں تجھے کہاں جا کر ڈھونڈوں......؟"

لیلیٰ کے گرد ان کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ جیسے وہ خیال ہی خیال میں بیٹی کو پا لینے کا یقین کر رہی ہوں۔

نسیمہ نے ہمدردی سے پوچھا۔

"کیا وہ بیمار تھی......؟"

"نہیں...... ایک روز ہمارے گاؤں کے کھلیان میں زبردست آگ لگی تھی۔ وہ ان شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔ گاؤں کے کسان جان کی بازی لگا کر اسے شعلوں سے نکال لائے۔ میں نے اس کے علاج کے لیے اپنی دولت پانی کی طرح بہا دی...... لیکن وہ بچ نہ سکی۔ مجھے روتا چھوڑ کر چلی گئی۔"

لیلیٰ کے چہرے پر آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔

وہ سہیم شحیم عورت رو رہی تھی۔ کیا ایسی حاکم اور جابر عورت کے سینے میں بھی ماں کا دل ہوتا ہے۔

انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں بہت گنہگار ہوں نسیمہ...... میں اپنے خاوند پر ہاتھ اٹھاتی ہوں۔ انہیں غلام بنا کر رکھتی ہوں۔ خدا مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ لیکن میں کیا کروں؟ وہ اپنی بدکاریاں کیوں نہیں چھوڑتے؟ میں اگر دب کر رہوں گی تو وہ اور بھی شیر ہو جائیں گے۔ میں کیا کروں؟ وہ کیسے باپ ہیں جو ایک بیٹی کی موت سے بھی عبرت حاصل نہیں کرتے ہیں......"

نسیمہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میں سمجھتی تھی کہ میں ہی دکھی اور مظلوم ہوں۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آتے ہیں...... ہائے! یہ اتنی ساری دولت بھی کسی کے آنسو نہیں پونچھ سکتی......"

وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"میں بہت صبر کرتی ہوں۔ دل کو سمجھاتی ہوں کہ موت آئی تھی، اس لیے عاشی مر گئی۔ لیکن موت کا وہ منظر مجھ سے بھلایا نہیں جاتا...... ہائے! کس طرح تڑپ تڑپ کر جان دی ہے...... ایسی اذیت ناک موت اسے کیوں ملی؟ اس معصوم نے کون سی غلطی کی تھی!"

نسیمہ اور لیلیٰ گم صم ہو کر اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

"میں لیلیٰ کو دیکھتی ہوں تو بے اختیار عاشی یاد آ جاتی ہے۔ اس بچی کو میں نے تنہا اسکول جاتے دیکھا ہے۔ ٹیوشن پڑھا کر تنہا آتے دیکھا ہے۔ یہ اپنے نازک کاندھوں پر زندگی کا بوجھ اٹھائے کیسی تنہا تنہا سی نظر آتی ہے۔ عاشی بھی کھلیان میں تنہا کھڑی تھی۔

نسیمہ...... شعلے صرف آگ کے نہیں ہوتے...... شعلے کئی طرح کے

ہوتے ہیں۔ جب ہمارے بچے ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ تب ہمیں احسا
ہوتا ہے کہ ہم نے ان کی حفاظت نہیں کی۔۔۔۔ تم اس بچی کی ہمیشہ حفاظت کرنا

نسیمہ نے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا۔

"میرے بس میں ہوتا تو میں اسے آنکھوں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے د
لیکن کیا کروں۔۔۔۔؟ یہ بیٹی نہیں، بیٹا بن کر سامنے آجاتی ہے۔۔۔
کبھی اس کے کام نہ آسکی۔۔۔۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ بیٹی میری عز
آبرو بچانے کے لیے گھر کی چاردیواری میں مجھے بٹھا کر رکھتی ہے اور خود
کے لیے نکل جاتی ہے۔"

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم گھر سے باہر جا کر خود اپنی حفاظت نہ
کرسکتی ہو۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ بہن!"

نسیمہ نے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا۔

"میں گھر سے باہر نکلتی ہوں تو عجیب گھبراہٹ سی طاری ہوجاتی ہے
لگتا ہے جیسے چاروں طرف سے لوگ مجھے گھور رہے ہوں۔ راستے میں بہ
سی موٹر گاڑیاں ادھر ادھر سے آنے لگتی ہیں تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جا
ہیں۔ ایک بار تو میں گھبرا کر بیچ سڑک پر بیٹھ گئی تھی۔ لیلیٰ کے ابا نہ جانے مجھے
طرح کھینچ کر سڑک کے کنارے لے آئے تھے۔"

"پھر تو لیلیٰ ٹھیک ہی کہتی ہے کہ تمہیں گھر سے نہیں نکلنا چاہیئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔۔ لیلیٰ کا بھی اس طرح گھر سے نکلنا مناسب
ہے۔ کم از کم اسے برقعہ ضرور پہننا چاہیئے۔"

لیلیٰ کا نازک سا دل اچانک ہی دھڑکنے لگا۔

اس کے کانوں میں عاصم کی سرگوشیاں بھنبھنانے لگیں۔

"پھر تو تم مجھ سے بھی پردہ کرو گی؟"

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

"اللہ۔۔۔! میں کیا کروں؟ امی تو پردے کے لیے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ
جاتی ہیں۔۔۔۔"

"میں تو نہیں کروں گی۔۔۔۔ عاصم کیا سوچیں گے۔ میں نے ان کی اتنی سی
بات بھی نہیں رکھی۔۔۔۔"

وہ احتجاج کے طور پر ماں سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ عاصم کی والدہ بول
پڑیں۔۔۔

"برقعہ پہننے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ سب تمہارے وقتوں کی چیزیں ہیں
خواہ مخواہ لیلیٰ کو اس میں نہ لپیٹو۔۔۔۔!"

نسیمہ نے اپنی بات منوانے کے لیے بحث کی۔

"لیکن اس میں نقصان ہی کیا ہے؟ ہمارے مذہب میں جب پردے کے
لیے کہا گیا ہے تو ہم پر پردہ لازم ہو جاتا ہے۔"

عاصم کی والدہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو نسیمہ۔۔۔۔! پردے کی صفت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ عورت
کی آواز بھی مرد کے کانوں تک نہ پہنچے۔ لیکن آج کے مشینی دور میں عورتیں گھر
سے باہر آکر محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔ لیلیٰ جیسی محنتی لڑکیاں ہمارے
ملک میں بے شمار ہیں۔ اسکولوں میں استانیاں بن کر اور ریڈیو اسٹیشن میں اناؤنسر
بن کر وہ اپنی آواز بیچنے پر مجبور ہیں۔۔۔۔ آواز کا پردہ تو اس طرح ختم ہو جاتا
ہے۔ اب رہا جسم کا پردہ۔۔۔۔ تاکہ عورت کو دیکھ کر مرد کی نگاہیں نہ للچائیں۔

لیکن لنیمہ . . . . ! جو چیز نگاہوں سے جس قدر پوشیدہ ہوتی ہے۔ دیکھنے والے کا تجسس اور بڑھتا ہے کہ اس پردے میں کس ماڈل کی عورت چھپی ہوئی ہے۔

جب برقعہ پہن کر بھی مرد کی نگاہیں بہیں نہیں بخشتیں تو پہننے کا فائدہ؟ ہے . .

پردے کا اصل مقصد حیا کی سلامتی ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان ایک اخلاقی حد بندی ہوتی ہے۔ جو لوگ ا اخلاقی حد بندی میں رہتے ہیں۔ ان کی شرم و حیا برقرار رہتی ہے۔ ورنہ سا پردوں میں بھی شیطان اپنی چال چل جاتا ہے۔

" ویسے اب بھی تمہارا یہی خیال ہے کہ لیلیٰ کو پانچ سیر کا برقعہ لاد کر گھوم چاہیے۔ تو پھر تمہاری مرضی ہے . . .

" میری مرضی سے کیا ہوتا ہے۔"

لنیمہ نے بے بسی سے کہا۔

لیلیٰ بھی پردے کے نام سے بھاگتی ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ آپ اسے قائل کریں گی۔ لیکن آپ بھی اس کی ہم خیال نکلیں . . . . ."

لیلیٰ نے اس موضوع سے بیزار ہو کر کہا۔

" امی . . . . ! اب آپ یہ ذکر نہ کریں تو بہتر ہے۔ مجھے اس ذکر سے ہی الجھن ہوتی ہے۔

اسی وقت دوسرے کمرے سے عاصم کی آواز سنائی دی۔

" امی . . . . ! میری چائے کہاں ہے۔؟"

عاصم کی والدہ نے کہا۔

" تو یہ ہے۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔"

" میں دے آتی ہوں۔"

لنیمہ فوراً ہی اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

لیلیٰ نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے یقین ہو گیا کہ عاصم کی والدہ کے سمجھانے پر اس کی امی اسے پردہ کرنے کے لیے اب کبھی نہیں کہیں گی۔

وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگی۔

اس کا دل کہہ رہا تھا۔

" ہاں . . . . . ! میں تم سے پردہ نہیں کروں گی۔ . . ."

تمہاری امی نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ انسان کو اخلاقی حد بندیوں میں رہنا چاہیے۔ . . .

کیا ہم تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہو کر ان حد بندیوں میں نہیں رہ سکتے؟

" ضرور رہ سکتے ہیں . . . خیالات کی پاکیزگی شرط ہے . . . ."

نئے مکان میں لیلیٰ کا دل لگ گیا تھا۔

دل اس لیے لگ گیا تھا کہ عاصم وہاں روزانہ صبح و شام پہنچ جایا کرتا تھا۔

صبح وہ اسکول جاتی تو عاصم بس اسٹاپ پر موجود ہوتا۔ شام کو اسکول سے بیگم بھٹی کے گھر تک وہ عاصم کے ساتھ جاتی تھی۔ وہاں سے دو گھنٹے بعد واپس آتی تو وہ اس کا انتظار کرتا رہتا۔

ایک ہفتہ تک یہی سلسلہ رہا۔

ایک ہفتہ تک وہ صبح و شام ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا چلتے رہے اور ہر قدم پر ذہنی طور سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے رہے۔

پھر وہ گاؤں واپس چلا گیا۔ . . . جانے سے پہلے دونوں نے وعدہ وہ دور ہونے کے باوجود ہمیشہ قلمی ساتھی بن کر رہیں گے۔

جانے والے کو یاد کرنے کے لیے ایک قلمی دوستی کا ہی سہارا رہ گیا لیلیٰ کے دل میں ایک عجیب سی اداسی چھا گئی تھی۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا پڑھنے بیٹھتی تو کتاب کھلی کی کھلی رہ جاتی۔ الفاظ گڈمڈ ہو کر عاصم کی صورت کر لیتے۔ . . کھانے بیٹھتی تو لقمہ ہاتھ میں رہ جاتا۔ کئی بار وہ بس میں بیٹھ اسکول کے اسٹاپ سے آگے نکل گئی۔ خیالات سے چونکنے پر اسے پھر اسکول پیدل واپس آنا پڑتا تھا۔

اس عمر میں دوستی ایسی ہی گہری اور طویل ہوتی ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں دیتی۔

ایسی ظالم عمر ہے۔ ہمارے ہاں جو نوجوان خود کو نہیں سنبھال پاتے دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن لیلیٰ نے رفتہ رفتہ خود کو سنبھال لیا تھا۔ . . . نہ سنبھلتی تو اتنی اچھی پڑھ ہاتھ سے نکل جاتی۔ کئی بار بیگم بھٹی نے اسے ٹوکا تھا کہ وہ رہ رہ کر کہاں کھو ہے . . . .

کئی بار ہیڈ مسٹریس نے اسے تنبیہ کی تھی کہ اس کے پندرہ روزہ امتحان کے پرچے کمزور ہو رہے ہیں۔

لہٰذا اس نے رفتہ رفتہ خود کو سنبھال لیا اور عاصم کے خطوط سے اپنی پاگل وہ آنکھیں کھول کر اس دنیا کو دیکھو اور سمجھو تو بہت سی اچھائیوں کے ساتھ بہت سی برائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ لیلیٰ نے اپنی دیوانگی سے چونک کر جب اس محلے کو دیکھا تو وہ کچھ اچھا بھی نظر آیا اور بُرا بھی۔

اچھا اس لیے نظر آیا کہ محلے کی عورتیں اور بوڑھے مرد اس کی عزت کرتے تھے۔ اور اٹھتے بیٹھتے اس کی دو سو روپے ماہوار کی آمدنی کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

اس کے باوجود یہ محلہ برا اس لیے لگا کہ دوسرے محلوں کی طرح یہاں بھی چند اوباش قسم کے نوجوان تھے۔ جو اسے آتے جاتے گرما گرم نظروں سے دیکھتے تھے۔ کبھی کھانستے کھنکارتے تھے۔ اور کبھی سیٹیاں بجا کر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

لیلیٰ نے اب یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ وہ ماں بیٹی جہاں بھی جائیں گی ان کے ساتھ یہی غیر انسانی سلوک ہو گا۔ کیونکہ ان کے سروں پر باپ بھائی یا کسی مرد رشتہ دار کا سایہ نہ تھا۔

اس دنیا میں جو عورتیں تنہا ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ لوٹ کا مال سمجھی جاتی ہیں۔

لیکن لیلیٰ اپنی ماں کی طرح بات بات پر گھبرا جانے والی لڑکی نہیں تھی کئی دنوں تک اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ان آوارہ لڑکوں کے والدین سے شکایت کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان کے والدین ہی انہیں گمراہی سے روک سکتے تھے۔

اس فیصلہ کے تحت وہ چھٹی کے دن ان لڑکوں کے ہاں باری باری گئی اور

ان کے بزرگوں سے بڑے ہی مہذب انداز میں شکایت کی ۔ ۔ ۔ ۔ ان
جن بزرگوں نے اس کی شکایت کو معقول سمجھا ۔ انہوں نے اپنے لڑکو
طعن کر کے سمجھا دیا کہ آئندہ لیلیٰ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہ آئیں۔
لیکن ان میں سے بیشتر لوگ ایسے تھے جو اپنے لڑکوں کو آوارہ تسلیم
پر تیار نہیں تھے ۔ ۔ ۔ بھلا اپنے سکہ کو کون کھوٹا سمجھتا ہے ۔ ؟
انہوں نے لیلیٰ کو ہی باتیں سنائیں۔
"اے اس محلے میں اور بھی تو نوجوان لڑکیاں ہیں ۔ ۔ ۔ انہوں نے
کبھی ہمارے لڑکوں کی شکایت نہیں کی ۔ تم کہاں کی حور پری آگئی ہو ۔ ۔
لیلیٰ نے عاجزی سے سمجھاتے ہوئے کہا
"انہوں نے اس لیے شکایت نہیں کی کہ ان کے سروں پر باپ ا
کا سایہ ہے ۔ انہیں چھیڑنے کی کوئی جرآت نہیں کر سکتا"
ایک لڑکے کی ماں نے جواب دیا۔
"تو پھر جاؤ نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے لیے بھی ایک باپ ڈھونڈ کر لے آؤ
سنا ہے کہ ماں ابھی تک جوان نظر آتی ہے کوئی نہ کوئی تو پھنس ہی"
لیلیٰ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔
وہ عورت اس کی ماں کو بالواسطہ گالی دے رہی تھی۔
لیکن وہ اس عورت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی ۔ وہ چپ چاپ غصہ میں
ہوئی واپس چلی آئی۔
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے ؟
کس طرح ان لوگوں سے اپنے لیے اور اپنی ماں کے لیے شرافت
جینے کا حق مانگے ؟ ۔

لیلیٰ کو اپنے سے زیادہ اپنی ماں کی فکر ہوتی جا رہی تھی ۔ محلے کے ہر گھر میں تسنیم
ی اور اس کی خوبصورتی کا چرچا تھا ۔ بہت سے لوگوں کا تو یہ خیال تھا
ماں بیٹی ہی نہیں ہیں ۔ ایک دوسرے کی بہنیں ہیں۔
یلیٰ کو تو خیر بہت سے لوگ بچی سمجھ کر نظر انداز کر جاتے تھے ۔ صرف وہی
جو کم عمری میں گمراہ ہو گئے تھے ۔ اسے پریشان کرتے تھے ۔ ورنہ زیادہ
ہی گرما گرم بحث کا موضوع بنی رہتی تھی۔
مکان کے ٹھیک سامنے گلی کے تنگ راستے کے دوسری طرف ایک پان
ے والے کی دکان تھی ۔ جہاں رات گئے تک جوان اور ادھیڑ عمر کے لوگ
ہر دونوں کے متعلق چٹخارے لے لے کر باتیں کرتے تھے اور بات بات پر
گاتے تھے ۔ پھر ہر قہقہہ پر یوں دروازے کی طرف دیکھتے تھے ۔ جیسے
روازہ ان کے قہقہوں کی دستک پر کھل جائے گا ۔ اور تسنیم کسی پوشیدہ
نے کی طرح ان کی جھولی میں آجائے گی۔
دونوں ماں بیٹی ایک ہی چارپائی پر سوتی تھیں اور رات کی خاموشی میں
ہقہوں کو سنتی رہتی تھیں۔
انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کمرے کی تاریکی میں وہ قہقہے ان کا گلا دبا رہے
وہ سہم سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ جاتیں ۔ اور اس وقت ایک
ے کو چھوڑتیں ۔ جب تک کہ وہ دکان بند نہ ہو جاتی اور فحش قسم کے فقرے
ہقہے ختم نہ ہو جاتے۔
تسنیم اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر جھیل رہی تھی۔
لیکن لیلیٰ ان غنڈوں کی کمینگی کو تقدیر کا کھیل سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی ۔
ے اور خدا بخش کے پنجوں سے نکلنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر زمانہ

سے کام لیا جائے تو تقدیر کا لکھا بھی بدل سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں اگر ذہانت سے نہ لیا جاتا تو خدابخش کے ہاتھوں لٹ کر لبنیٰ اسے بھی اپنی تقدیر سمجھ کر صبر کر لیتی۔

وہ کئی راتوں سے سوچ رہی تھی کہ یہ ہنگامے آخر کس طرح بند کئے جا سکتے ہیں۔؟ کس طرح انہیں انسانیت اور شرافت کا واسطہ دے کر سمجھایا جا سکتا ہے کہ ہمیں بھی اپنی ماؤں اور بیٹیوں کی طرح جینے دو۔۔۔۔

لیکن لیلیٰ کی سمجھ میں کوئی ایسی تدبیر نہیں آئی جس سے کہ وہ ان کی سوئی ہوئی انسانیت کو جھنجھوڑ سکتی۔۔۔۔ آخر ایک صبح اسکول جانے کی بجائے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کی کوٹھی میں چلی گئی۔

ایس پی کی کوٹھی میں ایک معمولی سی لڑکی کو جانے کی اجازت ہرگز نہ ملتی لیکن اتفاق سے ایس پی صبح کے وقت لان میں ٹہل رہا تھا۔ لیلیٰ نے گیٹ پر کھڑے ہوئے سپاہیوں سے اجازت لینے کی بجائے براہ راست اسے مخاطب کیا اور لان تک آنے کی اجازت حاصل کر لی۔

"کون ہو تم۔۔۔۔؟" ایس پی نے پوچھا۔

"میرا نام لیلیٰ ہے۔۔۔۔"

وہ مختصر الفاظ میں اپنی روداد سنانے لگی۔

"میں اپنی ماں کے ساتھ جامی اسٹریٹ میں رہتی ہوں۔ اس محلے میں ہم نئے نئے آئے ہیں۔ لیکن جناب! ہم جس محلے میں بھی جاتے ہیں وہاں کے غنڈے، بدمعاش ہمیں چین سے رہنے نہیں دیتے۔۔۔۔ جب سے ابا جان کا انتقال ہوا ہے۔ ہم نے یہی محسوس کیا ہے کہ تنہا عورتیں شرافت کی زندگی نہیں گزار سکتیں۔ آخر ہم کمزور ماں بیٹی کب تک اپنی عزت آبرو کی حفاظت کر سکتی ہیں۔ ہم نے ان بدمعاشوں سے التجائیں کیں۔ ان کے گھر والوں سے شکائتیں کیں لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔۔۔۔ تھک ہار کر میں قانون کا سہارا لینے آپ کے پاس آئی ہوں۔ اگر قانون نے بھی ہماری حفاظت نہیں کی تو میں خودکشی کر لوں گی۔ لیکن ایسی بے عزتی برداشت نہیں کروں گی۔"

یہ کہتے کہتے وہ رونے لگی۔

ایس پی نے اس کی داستان سے متاثر ہو کر اس سے بہت سارے سوالات کئے کہ وہ کیا کرتی ہے؟ آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟ وہ بدمعاش کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔؟

لیلیٰ کا جواب سن کر کہ وہ پڑھتی بھی ہے اور دو سو روپے ماہوار کماتی بھی ہے وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے بیگم بھٹی کا فون نمبر پوچھ کر کہا۔

"پہلے میں تم لوگوں کے متعلق تفتیش کروں گا۔۔۔۔ تم کچھ خیال نہ کرنا۔ بہت سی عورتیں شریفوں کے محلوں میں مکان کرائے پر لے کر گندگی پھیلاتی ہیں اور ان بدمعاشوں سے زیادہ معاشرے کو خراب کرتی ہیں۔۔۔۔ اگر تمہارا بیان سچ ثابت ہوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ تم عزت آبرو سے روزی حاصل کر رہی ہو تو پھر وہ بدمعاش تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔۔۔ ان کا بندوبست میں کر لوں گا۔"

اس کی یقین دہانی پر وہ مطمئن ہو کر واپس چلی آئی۔

دوسرے دن لیلیٰ کو اسکول میں پتہ چلا کہ پولیس والے اس کے متعلق انکوائری کرنے آئے تھے۔ بیگم بھٹی نے بھی یہی بتایا کہ وہ اس کے کیریکٹر کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

ہیڈ مسٹریس اور بیگم بھٹی کو یہ معلوم ہونے کے بعد کہ بدمعاش اسے اور اس

کی ماں کو پریشان کرتے ہیں.... انہوں نے پرزور اپیل کی تھی کہ اس معاملے میں بیلی کی مدد کی جائے۔

اس شہر کا ایس پی بہت ہی فرض شناس واقع ہوا تھا.... اسی رات بیلی کے سامنے پان کی دکان پر پولیس کا چھاپہ پڑا۔ اور وہاں جتنے بھی لوگ تھے حراست میں لے لیے گئے۔

اچانک چھاپہ مارنے کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ پان والے کے خفیہ کاروبار کا پتہ چل گیا.... وہ پان کے ساتھ کوکین بیچا کرتا تھا۔ اس لئے غنڈے بدمعاش اس کے زیادہ گاہک تھے۔

دوسری صبح بیلی کو چھیڑنے والے وہ نوجوان بھی تھانہ میں بلوائے گئے جن کی شکایتیں بیلی نے ان کے والدین سے کی تھی........ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک معمولی سی لڑکی کی مدد کرنے کے لیے قانون کے محافظ اس محلے تک چلے آئیں گے۔

لیکن اب وہ معمولی سی لڑکی نہیں تھی۔

سارے محلے میں اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

وہ جہاں سے گذرتی تھی۔ اوباش قسم کے لوگ وہاں سے کترا کر نکل جاتے تھے.... لیکن اندر ہی اندر ان کے دلوں میں انتقامی جذبہ ابھرتا رہتا تھا جن کے گھر والے گرفتار ہوتے تھے۔ ان کی عورتیں ماں بیٹی کے متعلق طرح طرح کی باتیں بنانے لگی تھیں۔

عاصم کی والدہ ایک آدھ دن کے لیے آتیں۔ تو نسیمہ کو اپنے ساتھ کار میں لے جاتیں..... غریب عورت کا ایک قیمتی کار میں بیٹھنا بھی بدنامی کا باعث بن گیا۔

کوئی دل جلا کہتا...... "بیٹی کا گاہک تو بڑا اونچا ہے۔"

کوئی دل جلی کہتی...... "ماں بھی کار میں جاتی ہے۔"

"ارے بھئی...... بڑے بڑے افسروں کی محفلیں گرم کرتی ہیں۔ اسی لئے چھاپہ ڈلوایا ہے......"

مارنے والوں کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے۔ لیکن کہنے والوں کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔

بات روز بروز بگڑتی چلی گئی۔

عاصم کی والدہ نے نسیمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نسیمہ..... اس طرح کبھی تمہاری زندگی سکون سے نہیں گذرے گی میری بات مانو اور دوسری شادی کر لو۔"

نسیمہ ایک گہری سانس لے کر سوچنے لگی۔

تمام حالات اس کے سامنے تھے..... ایسے حالات جو بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔

اس نے بے بسی سے کہا۔

"یہ سچ ہے کہ مرد کے بغیر عورت محفوظ نہیں رہ سکتی..... لیکن کیا کروں دل نہیں مانتا.... لوگ بیوہ کو تو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کی اولاد کو قبول نہیں کرتے......"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ایسا رشتہ تلاش کروں گی کہ تمہارا ہونے والا خاوند بیلی کو اپنی بیٹی بنا کر رکھے گا..... ویسے بھی تمہیں بیلی کی فکر نہیں کرنی چاہیے ماشاء اللہ! ابھی سے وہ تنہا اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی ہے۔ اس میں اتنی صلاحیتیں ہیں کہ وہ تنہا زندگی گذار سکتی ہے....."

پھر انہوں نے ذرا رک کر اور نسیمہ کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اگر تم میری ایک بات یاد رکھو تو وہ تنہا بھی نہیں رہے گی۔"

"کیسی بات.....؟"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"میں اسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ میں آج یہی سوچ کر آئی ہوں کہ تم سے اپنے دل کی بات کہوں گی۔"

نسیمہ نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر خوشی سے کہا۔

"آپ مجھ پر اتنا بڑا احسان کر رہی ہیں کہ جس کے متعلق میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ "یہ کیا کر رہی ہو۔"

انہوں نے گھٹنوں پر سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

یہ تو تمہارا احسان ہوگا کہ میرے گھر میں ایک بیٹی کی کمی پوری کر دو گی۔ نہ جانے کیوں؟ جب میں اسے دیکھتی ہوں تو مجھے عاشی یاد آجاتی ہے۔ جی چاہتا ہے اسے ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھوں۔

"نسیمہ..... جو لوگ اپنی عزیز ترین چیز کھو دیتے ہیں۔ ان کے دل سے پوچھو کہ وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کتنے بے چین رہتے ہیں۔"

"میں آپ کے جذبات کو سمجھتی ہوں۔ خدا کرے کہ بیلی بہو بن کر جائے اور بیٹی کی کمی کو پورا کر دے۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

میرا تو جی چاہتا ہے کہ آج ہی بہو بنا کر لے جاؤں۔ لیکن جلد بازی اچھی نہیں ہوتی..... یہ بات ابھی ہمارے ہی درمیان رہنے دو۔ ورنہ ان کی تعلیم پر برا اثر پڑے گا۔ جب تعلیم مکمل کر لیں گے تو ہم ان کی شادی کی تاریخ مقرر

ریں گے....."

نسیمہ نے احسان مندی سے کہا۔

"آپ نے میرے دل سے ایک بڑی فکر دور کر دی ہے۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بیلی کی فکر نہ کرو۔ اپنی فکر کرو..... بیلی کے رخصت ہونے سے پہلے تم بھی اپنا ٹھکانہ بنا لو تو بہتر ہے۔

"عورت کہیں بھی عزت آبرو سے زندگی گزار سکے تو یہی اس کی پاکبازی کا سب سے بڑا انعام ہوتا ہے۔"

نسیمہ نے نیم رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کی کسی بات سے انکار نہیں ہے۔ لیکن..... پتہ نہیں بیلی کیا سوچے گی اس عمر میں شادی کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔"

"تم سے زیادہ عمر کی عورتیں شادی کرتی ہیں اور تمہاری شادی کو تو کوئی بچڑ ہی نہیں سکتا..... رہا بیلی کا سوال تو وہ بھلا کیا کہے گی۔ اسے تو اور زیادہ خوشی ہوگی۔"

انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بیلی ٹیوشن پڑھا کر واپس آئی تو دوسری شادی کیلئے ماں کی رضامندی دیکھ کر خوشی سے لپٹ گئی۔

"ہائے امی..... اب تو مجھے آپ کے لیے جہیز کا بندوبست کرنا ہوگا۔"

"چل ہٹ پگلی"

نسیمہ نے شرما کر کہا۔

"بیوہ عورت کہیں ٹھکانے لگ جائے، یہی بہت ہے۔ جہیز کے جھگڑے کنواری لڑکیوں کی شادی میں ہوتے ہیں....."

لیلیٰ نے مچل کر کہا۔

"پھر بھی امی . . . . باراتیوں کے لیے کھانا۔ آپ کے لیے چند جوڑے کپڑے اور کچھ نئی گرہستی کا سامان تو جوڑنا ہی پڑے گا . . . ۔"

یہ قدرت کی کیسی ستم ظریفی ہے۔ دستور کے مطابق ماں کو بیٹی کی فکر کرنا چاہیے تھی۔ لیکن وہاں بیٹی ماں کو بیاہنے کے جتن کر رہی تھی۔

وہ بیٹی کو عقیدت سے دیکھنے لگی اور سوچنے لگی۔

"میں اس بچی کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟ . . . . کچھ نہیں . . . . میں ماں ہوں، لیکن اس کے لیے آنے والے باراتیوں کے کھانے کا انتظام نہیں کر سکتی۔

اس کے لیے چند جوڑے کپڑے اور نئی گرہستی کا سامان نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس وقت میں پرائی ہو جاؤں گی۔ نیا گھر جانے کیسا ہو گا؟ وہاں سے ایک تنکا اٹھا کر بھی میں اپنی بیٹی کو دے سکوں گی یا نہیں . . . ؟

میں ایک جاہل عورت ہمیشہ سے محتاج رہی ہوں۔ پہلے خاوند کی محتاج پھر بیٹی کی محتاج . . . . اس کے بعد ایک اور نئے خاوند کی محتاج . . . میں کیا ہوں؟ کچھ بھی نہیں . . . . میں اتنی مجبور ہوں کہ بیٹی کے ہاتھوں میں مہندی لگانے کی بجائے بیٹی کے ہاتھوں سے اپنی مہندی رچا کر رخصت ہو رہی ہوں . . .

تسنیمہ کی آنکھوں میں بے بسی اور مجبوری کے آنسو آ گئے۔

لیلیٰ اسے روتے دیکھ کر پھر لپٹ گئی۔

"آپ روتی کیوں ہیں امی . . . . ! آپ یہاں سے چلی جائیں گی تب بھی آپ کا خیال رکھوں گی۔ مصیبت کے وقت بیٹی کو یاد کر لینا۔ میں بیٹا بن کر پہنچ گی۔ آپ کے دودھ کی قسم، یہ میرا وعدہ ہے۔"

تسنیمہ نے پوری قوت سے اسے بھینچ لیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ ماں رو رہی تھی لیکن بیٹی یہ نہ سمجھ سکی کہ کیسے ظالم احساسات ہیں جو اسے رلا رہے ہیں۔

لیلیٰ اب سولہ برس کی نازک سی عمر سے گزر رہی تھی۔

عاصم بھی شہر آ کر کالج میں پڑھنے لگا تھا . . . . اسے کالج میں جو لیلیٰ کے سکول سے بالکل قریب تھا۔

چھٹی کے بعد وہ بس اسٹاپ پر ایک دوسرے کا انتظار کرتے تھے اور ملاقات ہونے کے بعد پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑتے تھے . . . . بس منٹوں میں انہیں پہنچا دیتی تھی۔ لیکن وہ منٹوں میں اس ملاقات کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے لوگ منزل تک پہنچنے کے لیے تیز چلتے ہیں۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ کیونکہ وہ راستہ ہی ان کی منزل تھا۔ جتنی دیر وہ اس راستے پر چلتے رہتے اتنی دیر انہیں منزل کو پا لینے کا سکون محسوس ہوتا تھا۔

لیلیٰ نے ایک دن مسکرا کر پوچھا۔

"آپ پیدل چل کر اپنے آپ کو کیوں تھکاتے ہیں؟"

وہ جانتی تھی کہ عاصم اس کی خاطر ٹیکسی میں نہیں جاتا۔ اس کے ساتھ زیادہ

سے زیادہ وقت گذارنے کے لیے پیدل چلتا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنی اہمیت محسوس کرنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر یہ سوال کیا تھا۔

عاصم نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"تم میرے ساتھ چلنے سے انکار کر دو۔ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا"

"میں کیوں انکار کروں ؟"

"پھر میں بھی کیوں ٹیکسی میں جاؤں ۔ ؟"

دونوں ہنسنے لگے۔ لیلیٰ نے کہا۔

"میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ آپ تھک جاتے ہوں گے۔"

عاصم نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"تھکن کا احساس آدمی کو تھکاتا ہے۔ تمہارے ساتھ چلتے ہوئے آج تھکن کا احساس نہیں ہوا ۔۔۔۔ جی تو چاہتا ہے کہ یہ راستہ اور طویل ہو جا

وہ زیر لب مسکرانے لگی۔

"چار مہینے کے بعد میرے امتحانات ہو جائیں گے۔ پھر اسکول کا یہ را چھوٹ جائے گا۔"

عاصم نے یاس انگیز لہجے میں کہا۔

"ہاں ۔۔۔ ! پھر یہ راستہ سنسان ہو جائے گا۔ دنیا کے ہنگامے ہ گے۔ لیکن تمہارے بغیر مجھے ایسی رونق نظر نہیں آئے گی۔

"لیلیٰ ۔۔۔۔ ! میں نے بارہا سوچا ہے کہ امی سے صاف کہہ دوں! یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ تعلیم مکمل ہونے سے پہلے امی یہ بات نہیں کریں گی"

"کون سی بات ۔۔۔۔؟"

"یہی کہ تمہیں دلہن بنا کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لوں۔"

لیلیٰ نے سر کے آنچل کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو واقعی ۔۔۔۔ تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔"

"کیا تم نہیں چاہتی ۔۔۔۔؟"

"میری چاہت کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن شادی سے پہلے جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ پہلے اس کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ مجھ پر بھی ایک ذمہ داری ہے۔ نہ جانے وہ کس طرح پوری ہوگی۔

اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کیسی ذمہ داری ۔۔۔؟"

بھول گئے ۔۔۔۔؟" لیلیٰ نے کہا "پہلے امی کی شادی کرنی ہے۔"

"ہاں ۔۔۔۔ !" عاصم نے کہا "میری امی اتنے دنوں سے رشتہ تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن اب تک بات نہیں بنی ۔۔۔۔ دراصل وہ بہت سوچ سمجھ کر تمہاری امی کا نکاح پڑھانا چاہتی ہیں تاکہ سسرال میں سکون سے زندگی گذر جائے۔ لیکن رشتے ملتے بھی ہیں تو کسی کے ہاں بچے زیادہ ہوتے ہیں اور کسی کے ہاں غریبی زیادہ ہوتی ہے۔

لیلیٰ نے جواباً کہا۔

"وہ غریبی اور تنگدستی سے گھبراتی نہیں ہیں ۔۔۔ مگر ہاں! آدمی کم از کم اس قابل ہونا چاہیے کہ دو وقت کی روٹیاں عزت سے حاصل کر لے۔"

ایسے بھی شریف لوگ مل جاتے ہیں۔" عاصم نے کہا "لیکن شریف آدمیوں میں بھی کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے۔ امی کہہ رہی تھیں کہ ایک شریف آدمی کا رشتہ مل رہا ہے۔ لیکن پہلی بیوی کے مرنے کے بعد کسی ایسی بیوہ سے شادی

کرنا چاہتا ہے جو اپنے ساتھ بچے نہ لائے ۔ ۔ ۔ ۔"

"اگر یہ شرط ہے تو منظور کر لینا چاہیئے۔"

یلیٰ نے کہا۔

"میں امّی کے ساتھ ان کے سسرال نہیں جاؤں گی۔"

عاصم اس کی جانب دیکھ کر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ وہ یلیٰ سے کہنا چاہتا تھا کہ تم ماں کے ساتھ سسرال جاؤ یا نہ جاؤ۔ لیکن شادی کے بعد اس آدمی کو پتہ چل جائے گا کہ تم دونوں ماں بیٹی ہو۔ اس آدمی نے بچے نہ ہونے کی جو شرط لگائی ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ عورت بچوں کی زیادتی سے بوڑھی ہو جاتی ہے اور وہ بوڑھی عورت سے نہیں، ایک جوان بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

عاصم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم اس کی شرط کو نہیں سمجھ سکیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر تمہاری امی کا کوئی چھوٹا بچہ ہو تو اسے میکے میں چھوڑ دیں۔ لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن تمہیں دیکھ کر تو صا پتہ چل جائے گا کہ تمہاری امی کی عمر بہت زیادہ ہے۔"

یلیٰ کی سمجھ میں بات آگئی۔

یہ کھلی حقیقت ہے کہ شادی کرنے والے چاہے کنواری لڑکی سے شادی کریں یا بیوہ عورت سے ۔ ۔ ۔ اس کی عمر ضرور دیکھتے ہیں۔

مرد خواہ جوان ہو یا بوڑھا وہ شادی کے لیے پہلا سوال جو اٹھاتا ہے وہ عورت کی عمر کے متعلق ہوتا ہے۔ شاید اس لیے عورتوں نے اسے فطرتِ ثانی بنا لیا ہے کہ زندگی کے ہر دور میں وہ اپنی عمر کم بتاتی ہیں۔

لیکن وہ اپنی ماں کی عمر کس طرح کم بتائے؟

لوگ تو اسے دیکھ کر اس کی ماں کی عمر کا اندازہ کر لیں گے۔

عاصم کی والدہ نے ڈیڑھ سال کی مسلسل جستجو کے بعد یہ رشتہ تلاش کیا تھا اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نہ معلوم اور کتنے عرصہ تک یہی تلاش جاری رہے گی۔ اور یہ ظاہر ہی تھا کہ جب بھی رشتہ ملے گا۔ عمر کا مسئلہ ضرور اٹھایا جائے گا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس مسئلہ کو کس طرح حل کرے۔

وہ اپنی شادی سے پہلے ماں کی شادی اس لیے ضروری سمجھتی تھی کہ ماں اپنا الگ گھر بسا لے اور بیٹی کی محتاج ہو کر اس کے سسرال میں نہ رہے ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

وہ عاصم کے ساتھ چلتی ہوئی ایک دوراہے پر آکر رک گئی۔

یہاں سے ایک راستہ عاصم کے گھر کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ یلیٰ کے گھر کی طرف ۔ ۔ ۔ ۔

عاصم نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ہم آہستہ آہستہ چیونٹی کی چال چلتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ دوراہا آجاتا ہے"

یلیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"کل میری چھٹی ہے۔ صبح ٹیوشن سے واپس آؤں گی۔ تب ہی آپ سے ملاقات ہو گی۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔"

عاصم نے خوش ہو کر کہا۔

"واپسی پر تم اسی پارک میں آنا، میں انتظار کروں گا۔"

یلیٰ نے سر ہلا کر ہولے سے کہا۔

"اچھا..... تو میں چلوں!"

دونوں نے ایک دوسرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔

"خدا حافظ.....!"

وہ اپنے اپنے راستے پر چل پڑے

عاصم کا گھر وہاں سے بہت دور تھا۔ لیکن لیلیٰ کو صرف ایک فرلانگ تک چلنا پڑتا تھا۔

جب وہ گھر پہنچی تو عاصم کی والدہ آئی ہوئی تھیں اور کمرے میں بیٹھی کی ماں سے باتیں کر رہی تھیں۔

لیلیٰ باہر ہی رک گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر انکی با سننے لگی۔

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ اسے اچانک رک جانا پڑا تھا۔ عاصم کی والد رہی تھی۔

"لیلیٰ میری بہو بن کر جائے گی۔ تم وہاں بیٹی کے ساتھ رہ کر تمام زن گذارنا چاہو تو میرے ماتھے پر کبھی شکن نہیں آئے گی۔ بلکہ مجھے خوشی ہوگی

لیلیٰ کا دل مسرت سے دھڑکنے لگا۔

عاصم کے ساتھ جس سہانے مستقبل کا خواب دیکھ رہی تھی، اس تعبیر آج عاصم کی والدہ کی زبان سے سن رہی تھی۔

ایک لڑکی کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کی کے مطابق اس کا مستقبل سنور جائے۔

عاصم کی والدہ نسیمہ سے کہہ رہی تھیں۔

"لیکن بہن تم خود نہیں چاہتیں کہ شادی کے بعد بیٹی کے سسرال میں

نہیں تنہا چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ تجربہ تو ہو ہی چکا ہے کہ عورت کو تنہا دیکھ کر لفنگے بدمعاش کس طرح کمینگی پر اتر آتے ہیں..... لہٰذا اب جو رشتہ میں تمہارے لیے لائی ہوں، اسے تم قبول کر ہی لو۔"

"میں انکار تو نہیں کر رہی ہوں۔"

نسیمہ نے جواب دیا۔

"لیکن میرے ساتھ اتنی بڑی لڑکی کو دیکھ کر وہ خود ہی انکار کر دیں گے۔"

لیلیٰ کو اچانک ہی احساس ہوا کہ اس کا وجود ماں کی شادی کے لیے ایک کاوٹ بن گیا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتی تو ماں اتنی عمر گذارنے کے بعد بھی بوڑھی نہ ہلاتی.... جوان بیٹی کو دیکھ کر ہی ماں کی عمر کا اندازہ کیا جا رہا تھا۔

وہ بڑے ہی دکھ سے اور بڑی ہی سنجیدگی سے ان کی باتیں سن رہی تھی عاصم کی والدہ کہہ رہی تھیں۔

"وہ لیلیٰ کو دیکھ کر بھی انکار نہیں کریں گے۔ میں نے اس کا ایک بہتر ریقہ سوچ لیا ہے۔"

"کیسا طریقہ.....؟" نسیمہ نے پوچھا۔

انہوں نے بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کہا۔

"تم کسی سے یہ نہ کہو کہ لیلیٰ تمہاری بیٹی ہے۔"

نسیمہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

پھر ہکلاتی ہوئی کہنے لگی۔

"یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے...!"

انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ دنیا چمک دمک کو دیکھ کر جھکتی ہے نسیمہ.....! دکانوں کے شوکیس اسی

یہ سجائے جاتے ہیں کہ گاہک کھنچے چلے آئیں۔ مرد چاہے کتنا ہی بوڑھا ہو۔
ہمیشہ جوان عورت سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔

ڈیڑھ سال تک تمہارے لیے دوڑ دھوپ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچ
کہ جب تک لیلیٰ کے نام کی تختی تمہارے گلے سے لٹکی رہے گی۔ اس وقت تک
تمہارے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں ملے گا۔

تسنیمہ ہچکچاتی ہوئی کہنے لگی۔

"لیکن یہ تو بڑی انہونی سی بات ہے کہ شادی کے لیے اپنی بیٹی کے ر
سے انکار کر دوں۔"

دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی بیٹی کے سینے میں ایک ٹیس اٹھی
نئے رشتے کے لیے پرانا اور اٹل رشتہ توڑنے کی شرط رکھی جا رہی تھی۔
ہائے امی۔۔۔! کبھی دودھ اور خون کا رشتہ بھی ٹوٹا ہے؟

عاصم کی والدہ سمجھا رہی تھی۔

"دنیا والوں کے سامنے اگر تم لیلیٰ کو بیٹی نہ کہو گی تو اس کا مطلب یہ
ہے کہ تم نے بیٹی سے رشتہ توڑ دیا ہے۔ یہ رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ کبھی ٹ
نہیں سکتا۔ وہ شادی کے بعد بھی تم سے ملتی رہے گی۔"

تسنیمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کس رشتے سے آ کر ملے گی۔ ظاہر ہے کہ میرے سسرال والے
سے سوالات کریں گے۔ کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اور میری کیا لگ

بہن۔۔۔۔۔!"

عاصم کی والدہ نے کہا۔

"تم دونوں ماں بیٹی کی بجائے آپس میں بہنیں بن جاؤ۔۔۔!"

لیلیٰ کے لبوں پر ایک پھیکا سا تبسم پھیل گیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ تبسم پھیکا
ں پڑا بلکہ بیٹی کا رشتہ، بہن کے رشتے میں بدل کر ذرا پھیکا پڑ گیا۔

ویسے یہ بڑی آسان سی تدبیر تھی جو عاصم کی والدہ کو سوجھی تھی۔ اس طرح
ں بیٹی کی بجائے دو بہنوں کو آمنے سامنے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تسنیمہ
مر زیادہ ہے۔

"تسنیمہ۔۔۔!" انہوں نے کہا۔ "اگر تم آپس میں بہنیں بن جاؤ تو پھر دنیا بھر کے
شتے اس دروازے پر آنے لگیں گے۔"

"لیکن۔۔۔۔!" اس نے کہا۔ "یہ تو سراسر جھوٹ بولنا اور اس مرد کو دھوکہ
ینا پڑے گا۔۔۔"

انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مرد یہ دھوکہ کھانا نہیں چاہتا کہ کہیں بوڑھی عورت اس کے پلے نہ باندھ
ی جائے۔۔۔ تمہیں دراصل دھوکہ نہیں دینا ہے بلکہ ثابت کرنا ہے کہ تم بوڑھی
یں ہو۔ تم نے صرف آٹھ برس تک سہاگن کی زندگی گزاری ہے۔ اس عرصہ
یں تم صرف لیلیٰ کی ماں بن سکی ہو۔ پھر قدرت بھی تم پر مہربان ہے۔ کسی کل سے
بھی عمر رسیدہ نظر نہیں آتیں۔ ہر شخص تمہیں دیکھ کر یہی کہے گا کہ تم لیلیٰ کی بڑی
ہو۔

تم لیلیٰ کو بیٹی نہ کہہ کر اپنے ہونے والے خاوند پر ثابت کرو گی کہ واقعی
یسی جوان عورت ہو جس کا وہ متلاشی رہا ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ تم اس سے جھوٹ بولو گی۔۔۔ تو بہن۔۔۔! اس مکر و فریب
دنیا میں اپنی بقیہ زندگی سکون سے گزارنے کے لیے ایک بار جھوٹ بول دو
ے جینے پر صرف ایک بار جھوٹ بول دو۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ قیامت کے

دن اس جھوٹ کا سارا الزام میں اپنے سر لے لوں گی۔"

نسیمہ سوچ میں پڑ گئی۔

یہ حقیقت تھی کہ اس نے پہلے خاوند کی زندگی میں کبھی جھوٹ اور ہیرا پھیری کی باتیں نہیں کی تھیں..... اور نہ ہی وہ دوسرے خاوند سے جھوٹ بولنا چاہتی تھی۔

لیکن پھر اسے کسی مرد کا سہارا کیسے ملے گا۔

"کس طرح وہ کسی مرد کی پناہ میں رہ کر دوسروں کی غلیظ نگاہوں سے بچے گی؟"

"یا تو اسے ایک جھوٹ بولنا ہوگا۔ یا پھر ہزاروں ہوس بھری نگاہوں کا نشانہ ہونا پڑے گا۔

وہ شش و پنج میں رہ گئی۔

اسی وقت لیلیٰ دروازے کی اوٹ سے نکل کر کمرے میں آگئی۔

پہلے اس نے عاصم کی والدہ کو سلام کیا۔ پھر اپنی ماں سے کہا۔

"امی..... ! خالہ جان نے بہترین مشورہ دیا ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ آپ کب تک دنیا والوں سے تنہا لڑتی رہیں گی اور اپنی حفاظت کرتی رہیں گی؟"

وہ اسکول کی کتابوں کو ایک طرف چارپائی پر رکھ کر ماں کے قریب آئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگی۔

دنیا کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن ماں کا رشتہ اولاد سے کبھی نہیں ٹوٹتا..... آپ خون کے رشتے سے اور دودھ کے رشتے سے میری امی لیکن آج سے ایک نیا رشتہ بھی قائم ہو رہا ہے۔ اب آپ زبان کے رشتے سے بہ بہن ہیں..... میں آپ کو سسٹر کہوں گی۔"

یہ کہتی ہوئی وہ ماں سے لپٹ گئی۔

"یہ دنیا بڑی ظالم ہے...... وہ میری زبان سے ماں کے لفظ کو مٹا رہی

آپ بھی اپنی زبان سے بیٹی کے نام کو کچل دیجئے ____؟"

"میری بچی ____"

نسیمہ نے اُسے پوری قوت سے بھینچ لیا۔

پھر اس کی آنکھوں سے یک بیک آنسو چھلکنے لگے۔

لیلیٰ نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"میری بچی نہیں ____ آپ مجھے صرف لیلیٰ کہئے ____ آپ مجھے پہلے بھی تو لیلیٰ ہی کہتی تھیں۔

ہاں ____ کبھی کبھی آپ محبت کے جوش میں بیٹی کہہ دیتی ہیں ____ بس، جوش اور جذبے کو کچلنا ہے ____ اسے کچل دیجئے ____ اتنی جلدی نہیں آہستہ ____ آج، کل، پرسوں ____ ابھی بہت وقت ہے۔ آپ تو ذرا ذرا بات پر گھبرا جاتی ہیں۔

وقت کے ساتھ بہت سی باتیں بھلا دی جاتی ہیں امی ____ ! یہ رشتہ بھی ناقابلِ فراموش نظر آتا ہے۔ یہ بھی رفتہ رفتہ ہماری زبان سے نابود ہو جائے گا۔

عاصم کی والدہ اس کی باتوں سے بہت زیادہ متاثر ہو رہی تھیں۔

وہ سوچ رہی تھی کہ یہ لڑکی کتنے صبر و تحمل سے اپنی ماں [illegible] رہی ہے ماں بیٹی کے رشتے کو ختم کرتے ہوئے [illegible] کے دل کو بھی [illegible] پہنچ رہا لیکن وہ ماں کے سامنے ایک ذرا بھی اپنے صدمہ کا اظہار نہیں کر رہی۔

____ کس قدر معاملہ فہم اور حوصلہ مند لڑکی ہے یہ ____

لیلیٰ کہہ رہی تھی۔

"امی ____ ! ہمارے لیے جو سب سے اہم مسئلہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہم

کس طرح عزت آبرو سے زندگی گذار سکتی ہیں ۔۔۔ اس کا صرف ایک ہی راز
"ایک اچھا گھر ۔۔۔ ایک محفوظ پناہ گاہ حاصل کرنے کے لیے صرف ایک
بار جھوٹ بول دیجیئے ۔۔۔"

لنیمہ نے پھر اسے پوری قوت سے بھینچ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیلیٰ ۔۔۔ !

اس بار بیلیٰ کی بھی آواز بھرا گئی۔ اس نے ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے

"سسٹر ۔۔۔ !"

ماں بیٹی ایک نئے محلے میں اُٹھ آئی تھیں۔

پرانا محلہ اس لیے چھوڑ دیا کہ وہاں بہت سے لوگ انہیں ماں بیٹی کی حیثیت سے جان گئے تھے۔

عاصم کی والدہ نے مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی اور جگہ چلے جائیں۔ جہاں کوئی پہچانتا نہ ہو اور ماں بیٹی کے رشتے کے متعلق پہلے سے جانتا نہ ہو ۔۔۔ اس بار بھی عاصم نے ان کے لیے نیا مکان تلاش کیا تھا۔ اور اس نئے مکان میں اور نئے محلے میں انہوں نے دو سگی بہنوں کی حیثیت سے ایک نئی زندگی کی ابتدا کرلی تھی

تین چار ماہ کے عرصہ میں ہی دونوں بہنوں کے لیے ڈھیر سارے رشتے

آنے لگے۔

ان میں کنوارے بھی تھے بیویوں والے بھی تھے ۔ اور بیوی کے بغیر بچے والے بھی ۔۔۔ عاصم کی والدہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لنیمہ کو اپنے گلے سے بیٹی کی تختی اتار دینا چاہیئے۔ چیونٹے مٹھاس دیکھ کر ہی آتے ہیں ۔۔۔ پھر عاصم کی والدہ نے لنیمہ کے لیے اسی محلے سے گھر کا انتخاب کیا۔ تاکہ لنیمہ اس گھر میں بیاہ کر جانے کے بعد بھی اسی محلے میں بیلیٰ کے قریب رہے۔

بیلیٰ کے لیے بھی جو رشتوں کا سیلاب آرہا تھا۔ اب انہیں روکنے کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ عاصم سے اس کی منگنی کر دی جائے۔

لنیمہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اپنی شادی سے پہلے بیٹی کے مستقبل کی ضمانت حاصل کرلے ، لہٰذا یہ بات طے پاگئی کہ ایک ہفتہ بعد عاصم کی والدہ یہاں منگنی کی رسم ادا کریں گی۔

انسان اپنی خوشحالی کے لیے کیسے کیسے جتن کرتا ہے ؟ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لیے کیسے کیسے منصوبے بناتا ہے لیکن اکثر ان منصوبوں کے دوران تقدیر کی مخالفت کی دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں۔

بیلیٰ اور عاصم کا مستقبل بنتے بنتے اچانک ہی بگڑ گیا۔

عاصم کی والدہ اسے بہو بنانے کے خواب دیکھتی ہوئی یہاں سے گئی تھیں لیکن گاؤں جاتے ہوئے راستے میں کار کا حادثہ ہو گیا۔

یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی صحت مند عورت یاب یک موت کو گلے لگالے گی ۔۔۔ لیکن موت کسی کی صحت اور دولت کو نہیں دیکھتی۔

وہ مخلص عورت جاتے حادثہ سے ہسپتال پہنچتے پہنچتے دم توڑ گئی۔

یہ المیہ ایسا تھا کہ عاصم مہینوں اس ذہنی صدمہ سے متاثر رہا۔ بیلیٰ اور لنیمہ

بھی بار بار اس رحم دل عورت کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہیں ۔۔۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ سب کچھ جھوٹ ہے ۔۔۔ وہ کسی دن اچانک ہی گاؤں سے واپس آ جائیں گی ۔ اپنے بیٹے کی منگنی کریں گی ۔ اور ایک سرپرست کی حیثیت سے نبیلہ کو بیاہ کر رخصت کریں گی ۔۔۔ نہیں وہ اتنی جلدی نہیں مر سکتیں ۔۔۔

لیکن تقدیر کے اشارے پر موت اپنا وار کر چکی تھی۔

پھر اسی رنج والم میں دو مہینے گذر گئے۔

دسویں کے امتحان کا نتیجہ نکل چکا تھا۔

لیلیٰ ضلع بھر میں اول آئی تھی۔

زندگی میں ایک بار خوشی ملتی ہے اور دوسری بار دکھ کی چھائیاں منڈلانے لگتی ہیں ۔۔۔ ان ہی دنوں بیگم بھٹی اپنے بچوں کے ساتھ انگلینڈ جا رہی تھیں لیے لیلیٰ کو ٹیوشن سے بھی جواب مل گیا۔

مصیبتیں اس طرح چھپر پھاڑ کر آتی ہیں ۔ وہ مفلسی کے جس دور سے نکل تھیں ۔ ٹیوشن چھوٹتے ہی پھر اسی فاقوں کے مقام تک پہنچ گئیں۔

اب تو برے وقتوں میں کام آنے والی عاصم کی والدہ بھی نہیں تھیں۔ موجودگی سے کم از کم اس بات کا سہارا ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا میں تنہا نہیں ہیں۔

عاصم بھی اب ان کے ہاں کم ہی آنے لگا تھا۔

لیلیٰ جانتی تھی کہ ان دنوں وہ کس طرح ذہنی پریشانیوں میں مبتلا اس کی والدہ کا سایہ سر سے اٹھتے ہی خدا بخش نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیئے تھے۔

عاصم کی والدہ کا دستور تھا کہ وہ ہر ماہ خدا بخش سے کاروبار کی آمدنی اور اخراجات کا حساب لیتی تھیں ۔ اس بار عاصم اپنے باپ سے حساب لینے بیٹھا تو اس نے کاروبار میں نقصان کی تفصیل پیش کر دی۔

عاصم کے نام پر جو صابن کا کارخانہ تھا ۔۔۔ وہ بالکل دیوالیہ ہو چکا تھا۔ خدا بخش کے رجسٹر کے مطابق وہ کارخانہ قرضوں پر چل رہا تھا۔ اور ان قرضوں کی ادائیگی کا اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ کوٹھی بیچ دی جائے۔

یعنی عاصم کے نام پر جو کارخانہ اور کوٹھی تھی وہ سب کی سب خدا بخش کے ہاتھوں تباہ ہو رہی تھی۔

عاصم نے پہلے کبھی کاروبار میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ لیکن وہ بھی لیلیٰ کی طرح ذہین تھا۔ برے وقتوں میں گھبرانے کی بجائے ، بگڑے ہوئے حالات کو بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کوٹھی کو فروخت کر کے بگڑے ہوئے کاروبار کو سنبھالے گا۔ اگر وہ سنبھل گیا تو ایسی دوسری کوٹھی کسی وقت بھی وہ خرید سکتا ہے گاؤں میں اس کے نانا کی جائداد کچھ کم نہیں تھی لیکن وہ سب اس کے ماموں اور خالاؤں کے نام پر تھی۔ لہٰذا وہ اپنی ہی جائداد کے بل پر پھر سے ایک نئی زندگی کی ابتدا کر رہا تھا۔

لیلیٰ جانتی تھی کہ وہ بہت پریشان ہے ۔ ان پریشانیوں میں اس کی تعلیم بھی ضائع ہو رہی ہے ۔۔۔ وہ سوچتی تھی ، سمجھتی تھی ۔ لیکن اس کے کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔

ان دنوں وہ خود بھی دسویں پاس کا سرٹیفکیٹ لیے ملازمت کی تلاش میں گھومتی رہتی تھی ۔ بڑی بڑی کوٹھیوں میں جا کر ٹیوشن کے لیے کوششیں

کرتی تھی۔

ایک وقت تھا۔ جب اسکول میں بیٹھے بٹھائے دو سو روپے کی ٹیوشن مل جاتی تھی۔ اب تو دروازے جھانکنے پر بھی کوئی پوچھتا نہیں تھا۔

مصیبتوں کے دور میں انسان کو ایسی ہی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کچھ لیلیٰ کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ دو دو وقت کے فاقے کر کے کس طرح گرمیوں کی دوپہر میں ماری ماری پھرتی ہے۔

عاصم اس سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ انہیں اب شادی کر لینا چاہیئے۔ شادی کے بعد لیلیٰ کو کم از کم دو وقت کی روٹیوں کی فکر نہیں ہوگی۔

لیکن وہ اپنا اور اپنی امی کا بوجھ ایسے وقت اس کے کاندھوں پر نہیں ڈالنا چاہتی تھی جب کہ وہ خود اپنے ہی بگڑے ہوئے حالات کو بنانے میں الجھا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ عاصم ان دنوں اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا لیلیٰ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ماں کو لیکر اب کبھی خدا بخش کے سامنے نہیں جائے گی۔ اور وہ بھی اس وقت عاصم سے شادی کرے گی۔ جب وہ علیحدہ رہائش اختیار کرے گا۔

لیلیٰ کے اعتراضات بالکل صحیح تھے۔ عاصم بھی انہیں تسلیم کرتا تھا۔ اور مایوسی سے سوچتا تھا کہ لیلیٰ کو دلہن بنانے اور ایک نئے گھر میں لے جانے کے لیے ابھی ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

نہ جانے ان کے دن کب پھرنے والے تھے؟ پھرنے والے تھے یا زیادہ بگڑنے والے تھے۔

بہرحال وہ حالات کا مقابلہ کئے جا رہے تھے۔

ایک ماہ بعد پھر ہیڈ مسٹریس نے اچانک ہی اسے بلا بھیجا ——

اس عرصہ میں جتنی بھی درخواستیں بھیجی تھیں، وہ سب کی سب ہیڈ مسٹریس کی معرفت روانہ کی گئی تھیں، تاکہ اس کی پر زور سفارش بھی شامل رہے۔

ہیڈ مسٹریس نے لیلیٰ کو دیکھتے ہی کہا۔

"سیٹھ مکرم کے ہاں سے انٹرویو کال آئی ہے۔ تمہیں کل صبح ان کی کوٹھی میں جانا ہو گا۔"

لیلیٰ دھڑکتے ہوئے دل سے اس انٹرویو لیٹر کو پڑھنے لگی۔

ہیڈ مسٹریس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

لیلیٰ —— سیٹھ مکرم بہت اچھے آدمی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ملازمت ہمارے بس کی نہیں ہے۔"

"اوہ باجی ــــ ایک گورنس کے فرائض انجام دینا کون سا مشکل کام ہے۔ آپ مجھے خوفزدہ نہ کریں۔"

ہیڈ مسٹریس نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ جو صحیح حالات ہیں۔ وہ تمہارے سامنے آ جائیں۔ تاکہ ان کی روشنی میں تم سوچ سمجھ کر قدم اٹھا سکو۔ اس ملازمت سے بھاگی ہوئی دو عورتوں سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ سیٹھ مکرم جتنا نیک آدمی ہے۔ اتنا ہی اس کا لڑکا بدمعاش ہے۔

"جی —— !" وہ گھبرا سی گئی۔

پھر اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔

"گورنس کی ملازمت کا مطلب تو یہ ہوا کہ لڑکا ابھی کم عمر ہے۔"

"ہاں —— وہ بارہ سال کا لڑکا ہے۔

لیلیٰ نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ وہ شرارتیں بھی کرتا ہوگا ار
بچوں جیسی —"

"ہاں، بچوں جیسی —!" ہیڈ مسٹریس نے طنزیہ کہا۔ "وہ گورنس ک
ایک ٹانگ پر کھڑا کر دیتا ہے اور تاحکم ثانی اگر وہ دونوں ٹانگوں پر کھڑی
تو اسے گندی گالیاں دیتا ہے اور بید سے مارتا ہے۔ بھلا تم ہی بتاؤ کو
ایسی شریف عورت ہے، جو یہ ذلت برداشت کرے گی۔

دوسری گورنس کا حلیہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک
وہ سو کر اٹھی تو اس کے لانبے اور خوبصورت بال کٹے ہوئے تھے۔ اد
بھر کے رہ گئے تھے۔

بیلی نے مایوسی سے پوچھا۔

"سیٹھ مکرم اپنے لڑکے سے کچھ نہیں کہتے؟"

"نہیں — ان کا خیال ہے کہ لڑکا نفسیاتی اعتبار سے احساس ک
کا شکار ہے۔ اس لیے گورنس کو ملازمہ سمجھ کر اپنی برتری جتاتا ہے۔ اس
جائز اور ناجائز حرکات کو برداشت کرنے کے صلے میں ہی گورنس کو پانچ
روپے ماہوار دیئے جاتے ہیں۔ اتنی بڑی تنخواہ کی لالچ میں کتنی ہی عورتیں
ہیں۔ لیکن گھبرا کر وہاں سے بھاگ آتی ہیں۔"

بیلی ایک سانس لے کر اس ملازمت کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے
اتنے عرصہ بعد ایک ملازمت مل رہی تھی۔ لیکن وہ بھی ناقابل قبول
لڑکا بد مزاج ہے — وہ گندی گالیاں دیتا ہے — وہ گورنس کو
کرتا ہے — بید سے مارتا ہے —

ہیڈ مسٹریس کی ہر ایک بات اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔

اچانک وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

پھر انٹرویو لیٹر کو اپنے وینٹی بیگ میں رکھتی ہوئی کہنے لگی۔

"باجی —! اس زندگی نے مجھے بہت ہی ذلیل کیا ہے۔
خدا کی قسم! بہت ہی ذلیل کیا ہے۔ اب اس لڑکے کے پاس کیا رہ گیا ہے
مجھے ذلیل کرے گا — میں جاؤں گی اور اس ملازمت کو حاصل کرنے کی
کوشش کروں گی —

پانچ سو روپے بہت ہوتے ہیں۔

ان روپوں سے میں ایک بیوہ کے سر پر سہاگ کا آنچل رکھ سکتی ہوں
اس آنچل کی رنگینی کے سامنے کون یہ دیکھنے آئے گا کہ میں نے ایک شاندار
کوٹھی کی چار دیواری میں کسی سے گالیاں کھائی ہیں —

مجھے معاف کر دیجئے باجی — اگر میں آپ کا مشورہ قبول نہیں کر رہی ہوں
آپ کی دعائیں لینے کی بجائے گالیاں سننے جا رہی ہوں۔

"اچھا — خدا حافظ —!"

"ٹھہرو —!"

ہیڈ مسٹریس نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم ایک مستقل مزاج لڑکی ہو۔ جس کام کا فیصلہ کرتی ہو
اسے کر گزرتی ہو

"بہر حال تم جاؤ — لیکن میرے ایک مشورہ کو بھی ذہن میں رکھو۔"

"جی ہاں — فرمائیے!"

میں نے ابھی کہا تھا کہ وہ لڑکا نفسیاتی اعتبار سے احساس کمتری میں مبتلا
ہے اور گورنس کو ایک حقیر ملازمہ سمجھتا ہے۔

تم پہلی ہی ملاقات میں یہ کوشش کرو کہ وہ تمہیں ملازمہ نہ سمجھے۔ اسے قابو میں رکھنے کی یہی ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی ہے۔"

"آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ باجی ——!"

وہ احسان مندی سے کہنے لگی۔

"میں یہی کوشش کروں گی اور کوئی ایسی تدبیر کروں گی کہ وہ مجھے ملازمہ نہ سمجھے — اچھا تو میں جاؤں؟"

"جاؤ —— میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

وہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔

ہیڈ مسٹریس اسے ممتا بھری مسکراہٹ سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اچانک مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اس کی پیشانی پر فکر و تشویش کی لکیریں ابھرنے لگیں۔

اتنی بڑی اور اتنی اونچی کوٹھی کے سامنے لیلیٰ ایک حقیر تنکے کی طرح نظر آرہی تھی۔

اس نے بڑی بڑی بادام جیسی آنکھوں پر گھنی پلکوں کو جھپکاتے ہوئے کوٹھی کے پھاٹک کو دیکھا۔ بے داغ فولاد کا بنا ہوا پھاٹک آفتاب کی تیز کرنوں سے چم چم چمک رہا تھا۔ اس چمک کے سامنے لیلیٰ کو اپنا وجود پھیکا، پھیکا سا معلوم ہونے لگا۔

اس عالیشان کوٹھی کا پہلا دروازہ ہی اسے احساس کمتری میں مبتلا کر رہا تھا۔

وہ آگے بڑھنے سے ہچکچا رہی تھی۔

پھاٹک کے قریب کھڑا ہوا ایک اونچے پورے قد کا پٹھان اسے بڑی دیر سے تذبذب کی حالت میں دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے اپنی گھنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔

"خو —— تم ادھر میں کس لیے کھڑی ہے۔؟"

"سیٹھ مکرم صاحب نے مجھے بلایا ہے" —— لیلیٰ نے بدقت کہا۔

"او، جاؤ بابا —— !مارا صاحب چھوکری موکری کو نہیں بلاتی۔ جاؤ ادھر سے ——"

اس طرح دھتکارے جانے پر اس کی آنکھوں سے کرب جھانکنے لگا۔ بے عزتی کے احساس سے اس کے سفید چہرے پر پہلی بار ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

دل نے کہا —— بے عزتی کا احساس کیسا؟ وہ تو جان بوجھ کر گالیاں سننے والی ملازمت حاصل کرنے آئی ہے۔

ہیڈ مسٹریس نے کہا تھا کہ صرف لڑکا بد مزاج ہے۔ لیکن یہاں تو بد مزاجی ابتدا دربان سے ہو رہی تھی۔

اس نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے پھاٹک کے ساتھ والے کیبن کی جانب اشارہ کیا اور پٹھان سے کہا۔

"تمہارے سیٹھ نے مجھے یہاں آکر کیبن سے فون کرنے کے لیے کہا تھا۔"
پٹھان نے کیبن کے حوالے سے مطمئن ہو کر کہا۔
"ادر تو ایسا بولو نا ــــ امارا صاحب کسی کو نہیں بلاتی ہے۔ فون کرنے بولتی ہے۔"
وہ بڑبڑاتا ہوا کیبن کے اندر چلا گیا
بیلی کے اندر اب پہلی سی جھجک نہیں رہی تھی۔
حالات اسے سکھا رہے تھے کہ کس طرح اچھی اور بری باتوں کو برداشت کرتے ہوئے اپنے مقصد کی طرف بڑھنا پڑتا ہے۔
وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کیبن کے دروازے پر آگئی۔
پٹھان ریسیور اٹھائے کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر بیلی کو دیکھا اور ریسیور کو اس کی طرف بڑھا دیا۔
وہ کیبن کے اندر آکر ریسیور کان سے لگاتی ہوئی بولی۔
"ہیلو ــــ میں بیلی طاہر بول رہی ہوں جناب ــــ آپ نے صبح انٹرویو کے لیے کال کیا ہے ــــ"
"ہم ــــ!"
دوسری طرف آواز آئی۔
"ہولڈ آن کرو ــــ"
بیلی کان سے ریسیور لگائے انتظار کرنے لگی۔
تھوڑی دیر بعد پھر وہی آواز آئی۔
"ہیلو ــــ مس بیلی طاہر۔"
"یس سر ــــ!"

تم آسکتی ہو۔ ریسیور دربان کو دے دو!"
اس نے ریسیور پٹھان کی طرف بڑھا دیا۔
پٹھان تھوڑی دیر تک دوسری طرف سے احکامات سنتا رہا۔ پھر وہ ریسیور ہک سے لٹکا کر کیبن سے باہر آیا اور بیلی کے لیے پھاٹک کے ضمنی دروازے کو کھول دیا۔
وہ دھڑکتے ہوئے دل سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پورشن تک جانے والے راستے پر چلنے لگی۔
راستے کے دونوں طرف کھلے ہوئے گلاب اور گل داؤدی اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ یہاں ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر آئی تھی اور اب محسوس کر رہی تھی کہ پھولوں کے سامنے اس کے رنگ دار کپڑے بالکل مرجھائے جا رہے ہیں۔
پورشن کے درمیان برآمدے میں ایک ملازم صاف ستھری وردی پہنے کھڑا تھا۔ اس نے بیلی کو دیکھتے ہی اپنے ساتھ آنے کے لیے کہا اور مؤدبانہ انداز میں آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔
برآمدہ چپس ٹائلز کا تھا۔ وہ چلتے وقت ایک آدھ بار پھسلتے پھسلتے رہ گئی۔ زندگی کے کھردرے اور ناہموار راستے پر چلنے والے پاؤں، سنگ مرمر کے راستوں پر چلنے کے آداب سے ناواقف تھے۔
وہ سنبھل سنبھل کر قدم جماتی ہوئی ایک سجے سجائے بڑے سے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔
سیٹھ نکرم کے سیکرٹری نے ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"کم ہیر ــــ دس وے ــــ!"

وہ سیکرٹری کے پیچھے چلتی ہوئی ایک دروازے تک آئی۔ وہاں ایک دبیز مخملی پردہ لگا ہوا تھا۔ وہ دل میں سوچنے لگی۔

"شاید یہی سیٹھ مکرم کا کمرہ ہے۔"

سیکرٹری نے پردے کو ہٹا کر دروازے کو کھولا۔

دوسری طرف کمرہ نہیں تھا۔ ایک کاریڈور تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر آگے بڑھ گئی۔

یہاں کے قیمتی ساز و سامان اور رنگا رنگ تصاویر سے سجی ہوئی دیواریں پاؤں کے نیچے اسفنج کی طرح ملائم قالین اور ــــ اور نہ جانے کتنی ہی آرائش کی چیزیں تھیں جو سیٹھ مکرم کی امارت کا یقین دلا رہی تھیں اور اس کی شخصیت سے ڈرا رہی تھیں۔

وہ کاریڈور سے چلتی ہوئی سیکرٹری کے ساتھ ایک زینے پر چڑھنے لگی زینے کی ریلنگ میں پیتل کی لانبی لانبی سلاخیں لگی ہوئی تھیں جو سونے کی طرح چمک رہی تھیں ــــ یہاں تو لیلیٰ کو ہر چیز سونے اور چاندی کی طرح نظر آ رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ شاید سیٹھ مکرم بھی ایسی ہی کسی دھات کا بنا ہوا انسان ہوگا۔

یہ جانے اس کوٹھی کے اندر کتنے پیچیدہ راستے تھے اسے پتہ نہیں چلا کہ وہ کن راستوں سے گذر رہی ہے۔

آخر چلتے چلتے سیکرٹری ایک دروازے پہ پہنچ کر رک گیا۔

اس نے لیلیٰ کو سر سے پاؤں تک یوں دیکھا جیسے اتنی دیر میں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ معمولی لڑکی ــــ معمولی لباس ــــ یہاں کے ملازموں کے کپڑے اس سے بہتر تھے۔

سیکرٹری نے بڑی بے اعتنائی سے ہونٹ بچکا کر دروازے پر دستک دی۔

"کم ان ــــ" اندر سے آواز آئی۔

"جاؤ ــــ!"

سیکرٹری نے اس سے کہا۔

"سیٹھ صاحب نے صرف پندرہ منٹ کے لیے وقت دیا ہے اسے اچھی طرح یاد رکھنا ــــ"

یہ کہہ کر اس کی طرف سے پلٹ گیا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ایک کاریڈور کی طرف مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لیلیٰ نے اپنی سانس اور دل کی دھڑکنوں پہ قابو پاتے ہوئے دوپٹے کے آنچل کو سر پہ درست کیا۔ پھر آہستگی سے دروازے کو کھول کر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

ادھیڑ عمر کا شخص ایزی چیئر پر لیٹا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم چہرہ، ٹھوڑی کے نیچے بھرا ہوا گوشت اور چوڑی پیشانی پہ پھیلی ہوئی شکنیں اس کی سخت مزاجی کا پتہ دے رہی تھیں۔

لیلیٰ نے اپنی پیشانی تک ہاتھ لے جاتے ہوئے احتراماً جھک کر کہا

"آداب ــــ!"

سیٹھ مکرم نے اپنے سامنے سے اخبار ہٹاتے ہوئے اس کمزور سی لڑکی کو دیکھا۔ پھر اس پیشانی کی شکنیں اور گہری ہو گئیں۔

اس نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔

"کیا تمہارا ہی نام لیلیٰ طاہر ہے؟"

لیلیٰ نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

"جی ہاں — !"

"نان سنس — !" اس نے اچانک سخت لہجے میں کہا "تمہاری جیسی

چھوکریاں یہ ملازمت نہیں کرسکتیں —"

لیلیٰ کا دل ڈوبنے لگا۔

سیٹھ مکرم نے اسے ایک نظر دیکھتے ہی فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ ملازمت

کے قابل نہیں ہے۔

وہ کتنی ساری امیدیں لے کر یہاں آئی تھی۔ اپنی روتی بسورتی زندگی

کے آنسو پونچھنے کے لیے بڑی مشکلوں سے یہ در نصیب ہوا تھا — د

نے دھمکی دی کہ یہاں سے ناکام واپس گئی تو باہر پھر وہی فاقے منہ کھ

کھڑے ہوں گے اور اپنی سسٹر کو بیاہ کر رخصت کرنے کے لیے کہ

پھوٹی کوڑی بھی ادھار نہیں دے گا

یک بیک اس نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کسی بھی کام کے لیے آزمائش شرط ہوتی ہے۔ آپ مجھے آزمائے بغیر

مایوس کر رہے ہیں!"

سیٹھ مکرم نے اپنی آنکھوں سے عینک اتار کر پھر ایک بار اسے دیکھا

اور کہا۔

"لڑکی — ! تم خواہ مخواہ میرا وقت برباد کرنے آئی ہو — ... کیا اش

میں یہ واضح طور پہ نہیں لکھا تھا کہ ہمیں ایک تجربہ کار گورنس کی ضرورت

"جی ہاں — ... تجربہ کار گورنس کے لیے کہا گیا تھا۔ لیکن عمر کی کوئی ق

نہیں تھی۔"

"نان سنس — !"

انہوں نے سر اٹھا کر کہا۔

"تجربات گذرتی ہوئی عمر کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں۔ اور ابھی تمہاری

عمر ہی کیا ہے ؟"

"سولہ برس چار مہینے — !"

لیلیٰ نے جواب دیا۔

"آپ اسی سے میری ذہانت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے اتنی

سی عمر میں میٹرک پاس کیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ ضلع بھر میں اول بھی

آئی ہوں —"

تم کتابی دنیا کی ذہانت لے کر آئی ہو اور ہمیں عملی دنیا کا تجربہ چاہیئے۔

شاید تمہیں نہیں معلوم ہے کہ اب تک کتنی ہی تجربہ کار عورتیں آئیں — اور

آزمائش کے دوران گھبرا کر بھاگ گئیں۔

لیلیٰ نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

آپ کہتے ہیں کہ تجربہ کار عورتیں ناکام ہو کر چلی گئی ہیں۔ اسی طرح آپ

ہی کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملازمت کے لیے تجربہ کوئی ضروری

نہیں ہے۔ ورنہ تجربہ کار عورتیں یوں گھبرا کر یہاں سے نہ بھاگتیں۔"

سیٹھ مکرم نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس بار ان کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا

ہو گئی تھی۔

تم واقعی ذہین ہو۔ زبان سے نکلی ہوئی باتوں کو پکڑنا خوب جانتی ہو۔

ویسے یہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات انسان کے تجربات کام نہیں آتے صرف

اس کی حاضر دماغی کام آتی ہے۔

میرا لڑکا بارہ سال کا ہے۔ اسے غلط ماحول اور غلط تربیت نے اس نا
بگاڑ دیا ہے کہ اس کی بد دماغی کے باعث کوئی بھی گورنس ٹکنے نہیں پائی۔ لیا
سمجھ تو کہ وہ آدھا پاگل ہے۔

"کیا تم اتنی سی عمر میں ایک پاگل لڑکے کی گورنس بن کر رہ سکتی ہو۔"
لیلیٰ نے مکمل یقین کے ساتھ کہا۔

"پاگل، اتنے خطرناک نہیں ہوتے جناب ——— جتنا کہ ہوش مند خطرناک
ہوتے ہیں۔ پاگل بیچارے اپنی لاعلمی میں کوئی اضطراری حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ
ہوشمند کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت نقصان پہنچاتے ہیں۔"

سیٹھ مکرّم تھوڑی دیر تک اسے دیکھتے رہ گئے۔
پھر انہوں نے حیرت سے کہا۔

"تعجب ہے کہ اتنی سی عمر میں تم اتنی گہری باتیں کرتی ہو۔ کہیں
یہ بھی کسی کتاب کا رٹا ہوا سبق تو نہیں ہے۔؟"

"اسکول کی کتاب کا نہیں ——— زندگی کی کتاب کا سبق ہے۔"
وہ گہری سنجیدگی سے کہنے لگی۔

آپ میری عمر کو نہ دیکھیں۔ زندگی میں میں نے اتنی ناکامیوں کا
دیکھا ہے کہ اب کوئی ناکامی مجھے نہیں ڈراتی ———

یہی دیکھ لیجئے کہ آپ نے مجھے دیکھتے ہی ملازمت دینے سے انکا
کر دیا تھا۔ آپ اصولاً پندرہ منٹ سے زیادہ کسی اجنبی سے گفتگو نہیں کر
لیکن اس وقت بیس منٹ سے زیادہ ہو چکے ہیں۔

"مجھے ملازمت کے ناقابل سمجھنے کے باوجود آپ میری گفتگو میں دلچ
لے رہے ہیں۔ اپنی باتوں میں گم کر دینے کا سلیقہ کسی کسی کو آتا ہے۔ خبار

سیٹھ مکرّم نے اتنی دیر میں پہلی بار مسکرا کر اسے دیکھا۔
پھر وہ اخبار کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

"نان سنس ——— تم اتنی دیر سے کھڑی ہوئی ہو۔؟ بیٹھ جاؤ۔۔۔!
دیکھو، میرے نان سنس کہنے کا برا نہ ماننا۔ یہ کم بخت تکیہ کلام کی طرح میری
زبان سے چپک کر رہ گیا ہے۔"

لیلیٰ نے بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بزرگوں کی دی ہوئی گالیاں، بچوں کے لیے دعائیں بن جاتی ہیں۔ اور
شاید یہ دعا قبول بھی ہو رہی ہے۔"

انہوں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا۔۔۔۔۔ وہ کیسے؟"

"ایسے کہ میں ملازمہ بننے کے لیے یہاں آئی ہوں۔ لیکن آپ نے مجھے اپنے
برابر بیٹھنے کا درجہ دے دیا ہے۔"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں اچھے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ اور تم اچھی لڑکی ہو۔ لیکن ملازمت
کے سلسلے میں اب بھی مجھے یقین نہیں ہے کہ تمہاری جیسی کمسن لڑکی ایک معمر
گورنس کی طرح میرے لڑکے کی دیکھ بھال کر سکے گی۔

میری امی نے مجھے گود میں پالا ہے۔ لیکن وہ اکثر مجھے بوڑھی بیٹی کہتی
ہیں۔ اگر آپ نے کچھ دنوں کے لیے آزمائش کے طور پہ رکھ لیا تو مجھے یقین
ہے کہ آپ بھی مجھے بوڑھی گورنس کہنے لگیں گے۔"

سیٹھ مکرّم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ میں تمہیں ایک موقعہ دوں گا۔ لیکن میرا لڑکا یہاں

میرے ساتھ نہیں رہتا ہے۔ شادمان کالونی کی ایک کوٹھی میں اسکی رہائش ہے
"کیا وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتے ہیں۔؟"
"نہیں وہ میری فیملی سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ لیکن تم ابھی یہ نہ پوچھو کہ میں نے اپنے خاندان سے اسے دور کیوں رکھا ہے۔ اگر تم کامیاب ہو جاؤ گی۔ اور مستقل طور سے ملازمت کرنے لگو گی تو آہستہ آہستہ تمام باتیں تمہیں معلوم ہو جائیں گی۔"
"اچھی بات ہے۔ آپ مجھے وہاں کا پتہ بتا دیں۔
"پتہ تمہیں سیکرٹری سے معلوم ہو جائے گا۔ آزمائش کے دوران میری کار تمہیں لے جایا کرے گی۔ اور واپس گھر پہنچا دیا کرے گی۔ ملازمت مستقل ہونے کے بعد تمہیں ہمیشہ لڑکے کے ساتھ وہاں رہنا ہو گا۔
"جی بہت اچھا ۔۔۔!"
لیلیٰ نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا۔
"اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو میں فی الحال آپ کی کار میں نہیں جانا چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ آپ کے صاحبزادے کو کسی نئی گورنس کی اطلاع ملے ۔۔۔ میں پہلی بار ان سے اپنے طور پر ملنا چاہتی ہوں"
"وہ کیوں ۔۔۔؟"
لیلیٰ نے جواب دیا۔
میں نے آپ کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کے صاحبزادے کسی گورنس کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ اگر پسند کرتے تو اتنی تجربہ کار عورتیں وہاں سے نہ بھاگتیں ۔۔۔ پھر میں کیوں انہیں موقعہ دوں کہ وہ مجھے گورنس سمجھیں اور مجھ سے نفرت کریں۔ اس لیے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے

طور سے جاؤں"
انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"وائیری پولائیٹ ۔۔۔ مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے؟"
لیلیٰ نے اٹھتے ہوئے۔
"اب مجھے اجازت دیجئے، میں کوشش کروں گی کہ کل تک آپ کو میری کامیابی کی اطلاع مل جائے"
"آل رائٹ ۔۔۔۔!" سیٹھ مکرم نے کہا "میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ میرے لڑکے کو ایک اچھی گورنس مل جائے ۔۔۔ آئی وش یو گڈ لک!"
لیلیٰ جاتے جاتے رک گئی۔
پھر اس نے سیٹھ مکرم کی جانب دیکھ کر ایک معصوم مسکراہٹ سے کہا
"میں جا رہی ہوں ۔۔۔ ایک بار نان سنس کہہ دیجئے ۔۔۔!"
سیٹھ مکرم کے حلق سے اچانک ایک قہقہہ پھوٹ پڑا۔
انہوں نے قہقہوں کے دوران کہا۔
"نان سنس ۔۔۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو ۔۔۔!"
لیلیٰ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

شادمان کالونی اس لیے مشہور تھی کہ یہاں لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگ رہتے

تھے۔ اس علاقہ میں شاندار عمارتوں، خوشنما باغیچوں اور نئے نئے ماڈل کی ایئر کنڈیشنڈ کاروں کو دیکھ کر ہزار روپے ماہوار آمدنی پانے والے بھی خود کو غریب اور دو ٹکے کا آدمی سمجھنے لگتے تھے۔

لیلیٰ بھری پی ستر نمبر کی کوٹھی کو تلاش کرتی ہوئی معظم ولا کے سامنے آکر رُک گئی۔

سیکرٹری نے سیٹھ مکرّم کے لڑکے کا نام معظم ہی بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کوٹھی اسی کے نام پر معظم ولا کہلاتی ہے۔

لیلیٰ مین گیٹ پر کھڑی ہو کر تھوڑی دیر تک اس عمارت کی شان و شوکت کو دیکھتی رہی۔ سامنے ایک بہت ہی وسیع و عریض پھلواڑی تھی۔ یہاں سے وہاں تک رنگ برنگے پھولوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی بڑی پھولوں کی نمائش لگی ہوئی ہے۔

مین گیٹ پر کوئی دربان نہیں تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اس وسیع باغ میں چلی آئی اور حیرت سے سوچتی رہی کہ کوٹھی اپنی تمام شان و شوکت کے باوجود ویران سی کیوں لگ رہی۔ کوٹھی کا کوئی ملازم اور باغ کا مالی تک نظر نہیں آتا تھا۔

لیکن اس کی حیرانی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

اچانک ہی اسے اپنے دائیں بازو میں ایک چوٹ کا احساس ہوا اور وہ تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گئی۔

وینیٹی بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔

وہ دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کو سہلاتی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دور مالتی کی جھاڑیوں کے پاس ایک لڑکا اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈنڈا پکڑے کھڑا تھا اور اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا۔

لیکن نیچے پڑے ہوئے وینٹی بیگ کو اٹھانے کے لیے جھکی تو قریب ہی ایک گُلّی پڑی ہوئی تھی۔ وہ گُلّی کو اٹھا کر حیرت سے سوچنے لگی کہ رئیس زادے کبھی گُلّی ڈنڈا نہیں کھیلتے ——— وہ تو کیرم، پنگ پانگ اور بیڈمنٹن جیسے کھیلوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔

لیکن وہ لڑکا لاکھوں روپے کی کوٹھی کے سامنے اور ہزاروں روپوں سے سجائی ہوئی پھلواری کے درمیان کھڑا غریب بچوں کا کھیل، کھیل رہا تھا۔

لیلیٰ کو دیکھ کر وہ بڑے ہی غرور سے اکڑتا ہوا اور اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں ڈنڈے کو نچاتا ہوا۔ اس کے قریب آنے لگا ———

وہ نیلی ہاف پینٹ اور ایک بنیان پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں ننگے تھے اور مٹی سے اٹے ہوتے تھے۔ اس کے قریب پہنچ کر اسے گھورتے ہوئے پوچھا

"تم کون ہو ———"

لیلیٰ نے اپنے دائیں بازو کو ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"لیلیٰ ——— !"

اس نے بڑے ہی بے ڈھنگے انداز میں ہنستے ہوئے پوچھا۔

تمہارا مجنوں کہاں ہے۔ ؟

اس کی بات لیلیٰ کو بہت ہی بری لگی۔ لیکن یہ سوچ کر وہ اپنی ناگواری کا اظہار نہ کر سکی کہ شاید یہی سیٹھ مکرّم کا لڑکا ہوگا۔

جاہل بچوں کی طرح گلی ڈنڈا کھیلنے کی وجہ سے اور بدتمیزی سے گفتگو
کرنے کے باعث لیلیٰ نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ یہی وہ بگڑا ہوا لڑکا ہوگا
جسے سیٹھ نکرم کی ساری دولت بھی اب تک سنوار نہ سکی
تھی...

اس نے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے کہا۔
"تم نے جواب نہیں دیا کہ مجنوں کو کہاں چھوڑ آئی ہو۔؟
اس کے سوال سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اتنی سی عمر میں عشقیہ داستانیں
پڑھتا ہے۔ یا سنتا ہے۔ لیلیٰ جواب دینے کی بجائے پوچھنے
لگی۔
تم لیلیٰ مجنوں کی کہانی جانتے ہو۔
"کیوں نہیں ۔۔۔ ؟" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ "لیلیٰ مجنوں"
ہیر رانجھا، اور شیریں فریاد، بہت سی کہانیاں جانتا ہوں۔"
"فریاد نہیں فرہاد کہو ۔۔۔ لیلیٰ نے تصحیح کی
"تم میری آپا سے زیادہ نہیں جانتی ہو۔ وہ فریاد کہتی ہے تو فریاد
ہی ٹھیک ہوگا۔
لیلیٰ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کہانیاں تمہیں آپا سنایا کرتی ہے"
"ہاں ۔۔۔ بہت سی کہانیاں جانتی ہے۔
لیلیٰ نے لاپرواہی سے کہا۔
جانتی ہوگی ۔۔۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ مجھ سے زیادہ کہانیاں
کوئی نہیں جانتا۔"

وہ گھور کر اسے دیکھنے لگا۔ جیسے لیلیٰ نے یہ بات کہہ کر اس کی
آپا کی توہین کی ہو۔
پھر لیلیٰ کے ہاتھ سے گلی کو چھینتے ہوئے پوچھا:
کوٹھی کے اندر چلو گی۔
اس کے پوچھنے کا انداز عجیب سا تھا۔ جیسے پوچھ نہیں رہا ہو بلکہ
حکم دے رہا ہو۔ کہ تمہیں کوٹھی کے اندر جانا ہی ہوگا۔
وہ کوٹھی کی جانب دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔
میں یہاں سے گزر رہی تھی۔ تمہاری کوٹھی کو دیکھ کر رک گئی۔ گیٹ
پر کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ اس واسطے میں یہاں تک چلی آئی لیکن تم نے
اس گلی سے مجھے چوٹ پہنچائی ہے۔ یہاں تک آنے کی سزا تو مل ہی گئی
ہے۔ اب کوٹھی میں لے جا کر کون سے سزا دو گے۔؟"
اس نے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔
میں نے جان بوجھ کر نہیں مارا ہے۔ اب گلی تمہاری طرف چلی آئی
تو میں کیا کروں۔
"تم اتنے امیر باپ کے بیٹے ہو کر گلی ڈنڈا کھیلتے ہو۔؟
اس نے غرّا کر پوچھا۔
کیوں یہ اچھا کھیل نہیں ہے؟
اس کے ہاتھ میں گلی ڈنڈے کو دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ اس کا پسندیدہ
کھیل ہے۔ پھر لیلیٰ اس کی ناپسندیدگی کا اظہار کیوں کرتی ۔۔۔ ؟ اس
نے جلدی سے کہا۔
بہت اچھا کھیل ہے۔

جو لوگ اس کھیل کو برا کہتے ہیں۔ میں ڈنڈے سے ان کی خبر لیتا یہاں بہت سی پڑھی لکھی عورتیں گورنس بن کر آتی ہیں کہتی ہیں کہ یہ اچھا کھیل نہیں ہے — میں تو انہیں ایک منٹ بھی نہیں رہنے دیتا مار کر بھگا دیتا ہوں۔

لیلی نے مسکرا کر پوچھا۔

تمہارا نام کیا ہے — ؟

اس نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اصلی نام بتاؤں یا نقلی — ؟ اور تم یہاں کھڑی کھڑی باتیں کر رہی ہو؟ آؤ کوٹھی میں چلو —"

وہ آگے بڑھ گیا۔

لیلی اس کے پیچھے چلتی ہوئی بولی۔

اصلی اور نقلی نام کیسے ہوتے ہیں۔

اصلی نام وہ ہے جو میری امی نے رکھا ہے۔ اور نقلی نام وہ ہے جو یہاں آنے کے بعد میرے باپ نے رکھا ہے۔

لیلی نے وسیع برآمدے میں قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ماں نے کیا نام رکھا ہے۔

پھول — وہ مجھے ہمیشہ پھول کہہ کر پکارتی ہیں۔ میں جب بھی یہاں پھولوں کو دیکھتا ہوں۔ مجھے ماں کی یاد آجاتی ہے۔

کیا تمہاری امی نہیں ہے — ؟

نہیں وہ مہینے میں ایک بار آتی ہے۔ ایک وقت کا کھانا میرے ساتھ کھاتی ہیں۔ اور واپس چلی جاتی ہیں۔

وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی — اور حیرت سے پوچھنے لگی۔

"تمہاری امی یہاں تمہیں تنہا چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ ؟"

وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

ہاں — میرا سوتیلا باپ انہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتا —"

سوتیلا باپ — !؟" وہ حیرت سے بولی۔

اس وقت وہ ایک شاندار کوٹھی کے شاندار ڈرائنگ روم میں کھڑی ہوئی تھی۔ پاؤں کے نیچے سمندر کے جھاگ کی طرح ملائم قالین بچھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دنیا جہاں کے آرائشی سامان سے سجا ہوا۔ ایک بہت ہی خوبصورت کمرہ تھا۔ لیکن اس کی نگاہیں۔ یہ سب کچھ نہ دیکھ سکیں۔ صرف اس لڑکے کو ہی دیکھتی رہ گئیں۔ جس نے ابھی ایک سوتیلے باپ کا ذکر کیا تھا۔

سوتیلا باپ کون ہے ؟

کیا سیٹھ مکرم — ؟

"نہیں — ! وہ سوچنے لگی — "سیٹھ مکرم ایک سوتیلے بیٹے کو اتنی شاندار کوٹھی بنا کر نہیں دے سکتا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بیٹے کو اتنا عیش و آرام دے کر اور پھر سوتیلا باپ بن کر اس کی ماں کو اس سے الگ کر دے۔

اس نے ذہنی الجھن میں مبتلا ہو کر پوچھا۔

تمہارے والد کا نام کیا ہے۔ ؟

مکرّم علی ـــ"

وہ سمندر کے جھاگ پر چلتی ہوئی بولی۔

کیا مکرم صاحب تمہیں پھول کہہ کر نہیں پکارتے ؟

نہیں ـ انہوں نے میرا نام معظم علی رکھا ہے۔

لیلی کو یک بیک احساس ہوا کہ وہ بڑے آدمیوں کے ایک محل میں آگئی ہے۔ اتنی دیر بعد اسے خیال آیا کہ اس کے پاؤں کے نیچے ایک ملائم اور گدگداتا ہوا قالین ہے۔ چھت پر جدید طرز کے فانوس آویزاں ہیں۔ روغنی دیواروں میں ایک فش ایکوریم ہے۔ جس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا سفید سکرین ہے جس پر سولہ ایم ایم کی فلمیں دیکھی جاتی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دنیا جہاں کے اتنے سارے کھلونے جن سے کھیلتے کھیلتے بچپن، جوانی بڑھاپا۔ ساری عمر گذر جاتی ہے۔

اتنے سارے کھلونوں اور اتنے سارے تفریحی سامان کے درمیان وہ ہاتھ میں گلی ڈنڈا پکڑے کھڑا ہوا تھا۔

سیٹھ مکرم نے اپنے بیٹے کو بڑے آدمیوں کے محل میں لا کر اسے بڑے آدمیوں کا لباس اور بڑے آدمیوں کا نام دے دیا تھا لیکن اس کی فطرت کو نہیں بدل سکے تھے۔

لیلی نے مسکرا کر کہا۔

پھول بہت اچھا نام ہے ؟"

"ہے نا ـ ؟ اس نے خوش ہو کر کہا۔ میری امی بھی یہی کہتی ہیں ـــ"

"اچھا ـ" لیلی نے پوچھا۔ "تمہارے سوتیلے آبا کیا کہتے ہیں ـ ؟

"پتہ نہیں ـــ !"

اس نے شانے اچکا کر لاپرواہی سے کہا۔

"میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں ہے۔ صرف نام سنا ہے ۔ ۔ ۔"

"کیا نام ہے ان کا ـــ ؟"

"ان کا نام ـــ"

اس نے گلی اور ڈنڈے کو ایک طرف پھینک کر صوفہ کے ہتھے پر بیٹھتے ہوئے کہا

"ان کا نام خدا بخش ہے ـــ ؟"

لیلی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ پاؤں کے نیچے سمندر کے جھاگ والے قالین میں اندر ہی اندر دھنستی چلی جا رہی ہو ـــ

دنیا میں ایک ہی خدا بخش تو نہیں ہے ۔ ؟

لیکن خدا بخش کا نام سن کر لیلی کے ذہن کو بجلی کا شاک پہنچا تھا وہ اپنے دشمن کو کبھی نہیں بھلا سکتی تھی۔ جب بھی کہیں خدا بخش کا نام سنتی اس کی ساری سوچ اسی بجلی کے شاک کی طرف چلی جاتی ـــ

معظم نے صوفہ کے ہتھے سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تم اس طرح میرے چہرے کی طرف کیا تک رہی ہو؟"

"آں — !"

وہ چونک پڑی۔

"وہ — میں — سوچ رہی تھی کہ میں بھی ایک خدا بخش کو جانتی ہوں —"

"وہ جانتی ہو گی — !"

اس نے لاپرواہی سے کہا

"میں اسے جاننا بھی نہیں چاہتا —"

"کیوں — ؟"

"اچھا آدمی نہیں ہے میری ماں کو مجھ سے ملنے نہیں دیتا —"

لیلیٰ نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں جس خدا بخش کو جانتی ہوں وہ بھی اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ بھی میری ماں کا دشمن ہے!"

معظم حیرت سے اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھنے لگا۔

لیلیٰ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"اب تم میرے چہرے کی طرف کیا تک رہے ہو؟"

"آں — !"

وہ چونک پڑا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ جو بات مجھے اور میری ماں کو پسند ہے وہ تمہیں بھی پسند ہے جو ہمارا دشمن ہے وہی تمہارا بھی دشمن ہے۔

لیکن — !" وہ بولی — "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ دونوں خدا بخش ایک ہی آدمی ہیں؟"

"ایک ہی آدمی نہ ہوں۔ ہمارے دشمنوں کا نام تو ایک ہی ہے — !"

لیلیٰ نے تھکے ہوئے انداز میں صوفہ پہ بیٹھے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری امی کہاں رہتی ہیں؟"

پتہ نہیں۔ یہاں آنے سے پہلے اپنے نانا کے پاس رہتا تھا۔ امی کبھی کبھی وہاں آ کر مجھ سے ملتی تھیں۔ اب یہاں آ کر ملتی ہیں۔

"اور تمہارے نانا کہاں رہتے ہیں — ؟"

اب وہ کہاں ہیں؛ وہ مر گئے۔ اب اس مکان میں دوسرے لوگ آ کر رہنے لگے ہیں۔

اس نے صوفہ کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

"تمہاری زندگی کتنی الجھی ہوئی ہے۔ اتنا عیش و آرام، اتنی دولت اور اتنی خوشیاں ہونے کے باوجود تمہیں ماں کا پیار نصیب نہیں ہوتا۔ آج اس عالیشان کوٹھی میں بیٹھ کر مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ہر انسان کو محرومی ستاتی ہے۔ غریب کی جھونپڑی ہو یا امیر کا محل۔ ان کچے پکے گھروندوں کو اندر سے کریدا جائے تو عجیب عجیب سی کہانیاں سامنے آتی ہیں۔

"کہانیاں" کا لفظ سن کر معظم چونک گیا۔

کوٹھی کے باہر لیلیٰ نے اس کے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ اس سے زیادہ کہانیاں کوئی نہیں جانتا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر دیوار سے لگے ہوئے کال بٹن کو دبایا۔

بٹن کو دباتے ہی دور دور تک معظم کی آواز ابھرنے لگی۔

"آپا — آپا — آپا — !"

وہ خاموش کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ لیکن اس کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ابھرتی جا رہی تھی۔

بیلی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تمہاری آواز کس طرح گونج رہی ہے۔"

اس نے ہونٹ بچکا کر کہا۔

"در پتہ نہیں۔ یہاں اچھے سے اچھے رئیس کے مکان میں ایسی چیز[یں] نہیں ہیں۔"

اس نے کال بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے جس ملازم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس کے نام کا بٹن دبا[تا] ہوں۔ اب دیکھو مجھے باورچی کو بلانا ہو گا تو میں اس بٹن کو دباؤں گا"

اس نے دوسرے بٹن کو دبایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آواز گو[نجنے] لگی۔

"رمضان — رمضان — رمضان — !"

اتنے میں آپا وہاں پہنچ گئی تھی۔

معظم نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

تمہیں کتنی کہانیاں آتی ہیں — ؟

آپا نے سر جھکا کر جواب دیا۔

صاحب جی — اتنی کہانیاں آتی ہیں کہ روز آپ کو سنا[تی] رہوں گی۔

اس نے بیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ تم سے زیادہ کہانیاں جانتی ہیں۔"

"جی — !" وہ بیلی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ میں کیا جانوں صاحب جی! میں آپ کو روز ایک کہانی سناتی ہوں۔

ایک نہیں دس کہانیاں سنانی پڑیں گی۔ ورنہ میں تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دوں گا۔ اور بیلی کو یہاں ملازم رکھ لوں گا۔

بیلی ایک بیک اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی۔

"تم کیا مجھے ملازم سمجھتے ہو۔ میں کبھی کسی کی ملازمت نہیں کرتی۔ تم بات چیت سے مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ اس لیے میں تمہارے کہنے سے یہاں تک چلی آئی ہوں۔

معظم اسے گھور کر دیکھنے لگا۔

بڑے گھر کی لڑکیوں کی طرح بیلی کے چہرے پر میک اپ نہیں تھا۔ جو غریب لڑکیوں کو میک اپ نصیب نہیں ہوتا۔ وہ اپنی حسرت پوری کرنے کے لیے کم از کم آٹھ بارہ آنے کی لپ اسٹک ضرور ہونٹوں پر لگاتی ہیں۔ لیکن بیلی کے گلابی ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بھی نہیں تھی۔ ہاتھوں کا دھلا ہوا لباس بھی معظم کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ بے حد غریب لڑکی ہے۔"

اس نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

لباس دیکھ کر تو پتہ چلتا ہے کہ تم دو ٹکے کی لڑکی ہو — میرے یہاں کی ملازمت کو تم سمجھتی کیا ہو؟ جب میں سو سو کے نوٹ تمہیں دکھاؤں تو ساری اکڑ بھول جاؤ گی۔ ڈیڈی کہتے ہیں کہ میں جسے چاہوں اپنی دولت سے خرید سکتا ہوں۔

بیلا جواب دینے سے پہلے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ لڑکا گورنس بن کر آنے والی کتنی ہی عورتوں کو یہاں سے نکال چکا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ بیلا بھی اس مقصد سے آئی ہے تو شاید اس کا بھی یہی حشر کرتا۔ لیکن اب وہ دوسرے انداز میں اسے ملازمہ کے طور پر رکھنا چاہتا تھا۔

گورنس بھی تو ملازمہ ہی ہوتی ہے۔ لیکن بیلا یہاں فیصلہ کرکے آئی تھی کہ وہ ملازمت تو ضرور کرے گی۔ مگر اس لڑکے کو یہ محسوس نہیں ہونے دے گی کہ وہ ملازمہ ہے۔ ہیڈ مسٹریس کا یہ مفید مشورہ اسے بہت پسند آیا تھا اور وہ یہی کوشش کر رہی تھی کہ کس طرح اس لڑکے کے حاکمانہ رویہ کو ختم کردے۔

پھر اس نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"تمہارے ڈیڈی نے بہت ہی غلط بات کہی ہے۔ دولت سے تم مجھ جیسی لڑکی کو نہیں خرید سکتے۔ میں صرف ان لڑکے اور لڑکیوں سے دوستی کرتی ہوں۔ جو نیک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں اور محبت سے پیش آتے ہیں۔"

معظم کے چہرے پر سختی سے چھاگئی۔

ابھی اس نے آیا کو بڑے ہی غرور سے کہا تھا کہ وہ اسے یہاں سے نکال دے گا اور بیلا کو ملازمہ بنا کر رکھے گا۔ لیکن بیلا اس ملازمت کو ٹھکرا کر اس کے غرور کو ٹھیس پہنچا رہی تھی۔ اور ایک معمولی آیا کے سامنے اس کی توہین کر رہی تھی۔

اس نے بیلا کو دیکھتے ہوئے بڑے ہی طنزیہ انداز میں مسکرا

کر کہا۔

"عزت ــــ ہاں! میں تو تمہاری عزت کرنا بھول ہی گیا تھا۔"

پھر وہ باورچی سے کہنے لگا۔ جو بہت دیر سے وہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔

رمضانی! پھلوں کا جوس لے کر آؤ۔ ہم مہمان کی عزت کریں گے

رمضانی وہاں سے جانے لگا۔ بیلا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو! مجھے کھانے پینے کی خواہش نہیں ہے۔"

رمضان نے ذرا دیر رک کر اس کی بات سنی۔ معظم نے اسے رکنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔

معظم ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تم ملازمت کرنا نہیں چاہتی ہو تو نہ کرو۔ لیکن میں تمہیں اپنی کوٹھی دکھانے کے لیے یہاں لایا ہوں۔ میری کوٹھی ضرور دیکھ لو۔

میرے ساتھ آؤ میں تمہیں ایسی چیزیں دکھاؤں گا کہ تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔

بیلا نے انکار نہیں کیا۔ وہ اس کی ہر بات کو رد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تمہاری جو بات اچھی ہوگی۔ میں اس سے کبھی انکار نہیں کروں گی۔ اچھے لڑکے اپنے گھر کی اچھی اچھی چیزیں دکھاتے ہیں۔ اپنی ہابی کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔"

ہابی کی بات کہتے کہتے اسے عاصم یاد آگیا اور عاصم کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات یاد آگئی۔ وہ بھی کبھی ٹکٹیں جمع کرنے کی ہابی رکھتا تھا لیکن اُس کی ایک ہی بات سے متاثر ہو کر اس نے وہ ہابی چھوڑ دی تھی۔

اب ہر رئیس زادہ اس کی بات مان کر مہنگی ہابیز کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

وہ معظم کے ساتھ کوٹھی کے اندر گھومنے لگی۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ لیلیٰ کے شانہ بشانہ چلنے لگا۔ اور اپنی کوٹھی کی ایک ایک چیز کے بارے میں بڑے ہی فخریہ انداز میں بتانے لگا۔ کہ۔ یہ جاپان سے آئی ہے۔ وہ ہانگ کانگ سے منگوائی گئی ہے۔ ایران کی قالین — پیرس کی خوشبوئیں — کینیا کے ڈول۔ انگلینڈ کا فلم پروجیکٹر — اور امریکہ سے امپورٹ کی ہوئی کارٹون فلمیں — وہ ایک ایک چیز کو دکھاتے ہوئے اپنی امارت کا رعب جما رہا تھا۔

لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"انگلینڈ کہاں ہے۔ جانتے ہو؟"

"نہیں — ۔" اس نے جواب دیا۔

پیرس کس ملک میں ہے۔؟"

"مجھے کیا معلوم؟ یہ سب چیزیں ڈیڈی نے منگوائی ہیں؟"

لیلیٰ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

ایسی باتیں تم دوسروں کے سامنے کہو گے تو لوگ ہنسیں گے۔ اور

ہیں گے کہ اتنے امیر باپ کے بیٹے کے پاس سب کچھ ہے۔ لیکن تعلیم نہیں ہے۔

اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"مجھے دوسروں سے ملنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں تو کوٹھی سے باہر جاتا بھی نہیں ہوں۔ گھومنے پھرنے کو طبیعت چاہتی ہے تو کار میں بیٹھ کر جاتا۔ اور واپس آجاتا ہوں۔

لیلیٰ اس بارہ سال کے لڑکے کو ہمدردی سے دیکھنے لگی۔ وہ عمر کے لحاظ سے اس سے چھوٹا تھا۔ لیکن قد کے اعتبار سے اس کے برابر تھا۔

تم ساری عمر کوٹھی اور کار کے اندر بیٹھ کر نہیں گذار سکتے۔ تم لڑکے ہو۔ پردے میں بیٹھنے والی لڑکی نہیں ہو۔ جب تم اپنے نانا کے پاس رہتے تھے تو کیا اس طرح قیدی بن کر رہتے تھے۔؟ یا اپنے بہت سے دوست بنا کر ان کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے۔

یہاں گلی ڈنڈا کھیلنے والے لڑکے نہیں ملتے۔ اس نے جواب دیا۔

"کیرم اور بیڈمنٹن کھیلنے والے لڑکے تو ضرور مل سکتے ہیں"

وہ ایک کمرے میں پہنچ کر رک گئے۔ معظم نے صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تم یہاں بیٹھو میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔

پھر وہ جواب سنے بغیر واپس ہو گیا۔ دروازے پہ پہنچ کر اس نے لیلیٰ کی طرف پلٹ کر کہا۔

میں جسے چاہتا ہوں، دولت سے خرید لیتا ہوں۔ تم بھی جب تک ملازمہ بننے کے لیے راضی نہیں ہو گی۔ میں تمہیں اسی کمرے میں بند رکھوں

گا۔"

"کیا مطلب ــــ ؟"

وہ گھبرا کر دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔

لیکن اس سے پہلے ہی معظم نے باہر سے دروازے کو بند کر دیا۔

"دروازہ کھولو۔ مجھے یہ مذاق پسند نہیں ہے۔"

وہ دروازے کو بے تحاشا پیٹنے لگی۔ لیکن دروازے پر اس کے ہاتھوں کی دھمک کے ساتھ ساتھ معظم کے قہقہے بھی گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے۔

وہ چیخ چیخ کر تھک گئی۔

لیکن دروازہ نہ کھلا۔

ہیڈ مسٹریس نے پہلے ہی اسے منع کیا تھا کہ وہ یہاں ملازمت کا خواب نہ دیکھے، لیکن وہ اپنی ضد سے چلی آئی تھی۔

اور اب پچھتا رہی تھی۔

چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ لیکن کسی نے دروازہ نہیں

کھولا۔

جی میں آیا کہ رونا شروع کر دے۔ مگر یہ اس کی عادت کے خلاف تھا۔ دکھ مصیبت میں وہ رونے کی بجائے سوچنے، سمجھنے اور مصیبتوں کا حل تلاش کرنے کی عادی تھی۔

وہ کبھی فاقوں سے نہیں گھبرائی۔ ٹیوشن کر کے اور کاغذ کے تھیلے بنا کر وہ فاقوں کو ٹالتی رہی۔

ماں کو خدا بخش کے پنجوں میں دیکھ کر بھی اس نے خود کو کمزور نہیں سمجھا۔ بجلی کے ایک معمولی تار سے اس نے دشمن کو کمزور بنا دیا۔

محلے کے غنڈوں اور بدمعاشوں کو بھی اس نے ایس پی کی مدد سے سیدھا کر دیا تھا۔

پھر آج ایک بارہ سال کے جاہل امیرزادے سے شکست تسلیم کر لیتی؟

اسے یقین تھا کہ وہ یہاں سے نکل جائے گی۔ یہاں سے نکلنے کے بعد اس کا فیصلہ کیا ہوگا۔

کیا وہ یہاں گورنس بن کر رہ سکتی ہے؟

نہیں ــ دوسری عورتیں واقعی سمجھدار تھیں کہ یہاں سے بھاگ جاتی تھیں۔ لیکن پانچ سو روپے۔ ؟"

اگر وہ اتنی بڑی آمدنی کو چھوڑ دے گی تو ماں کی شادی کس طرح کرے گی۔ جہاں بات طے ہو چکی ہے۔ وہ لوگ ضد کر رہے ہیں کہ شادی اس ماہ ہو جائے۔

اگر وہ اس ملازمت سے انکار کر دے گی۔ تو اپنی تنہا زندگی کیسے

گزارے گی؟ عاصم بھی اس کے لیے پریشان رہتا تھا۔ اور اپنی پریشا
کے باوجود اس کا بوجھ اٹھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ لیکن وہ
عاصم پر بوجھ بن کر اسے اور زیادہ پریشانیوں میں مبتلا نہیں کرنا چا
تھی۔

ان حالات کے پیش نظر یہ ملازمت اتنی الجھی ہوئی نہیں تھی
کہ زندگی کے مسائل الجھ کر رہ گئے تھے۔ آج تک زندگی میں جس طرح
جدوجہد کرتی آئی تھی۔ اسی طرح معظم سے بھی جدوجہد کرنی تھی۔
گھبرانا کیسا؟

اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ہمت جواب نہ دے جائے
وقت تک وہ اس ملازمت کو برقرار رکھے گی۔

اس فیصلے کے ساتھ ہی وہ بند کمرے میں چاروں طرف اس طر
لگی۔ جیسے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی ہو۔

کمرے میں صرف ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں تھیں۔ درواز
سے بند تھا۔ اور کھڑکیوں میں جالیاں لگی ہوئی تھیں۔

وہ ایک کھڑکی کے قریب آ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

دوسری طرف ایک بیڈ روم تھا۔ اس کمرے کی ٹھنڈک سے
رہا تھا کہ وہ ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ پلنگ کے سائیڈ ٹیبل پر معظم کی تصو
رکھی ہوئی تھی۔ تصویر کے قریب ایک ٹیلی فون اور ٹیلی فون کے قریب
کی بھری ایک پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔

ابھی وہ بیڈ روم کو دیکھ رہی تھی کہ وہاں کا دروازہ کھل گیا۔ مع
مسکراتا ہوا کھڑکی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

بیلی نے اسے دیکھتے ہی کہا
"یہ کیا حماقت ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ اس طرح کمرے میں بند کر کے مجبور کر دو گے؟"

"میں جسے چاہتا ہوں اس کوٹھی سے نکال دیتا ہوں۔ اور جسے چاہتا ہوں اسے قید کر دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔

"ہیلو ـــ سیکرٹری، ڈیڈی کو فون پر بلاؤ ـــ!"

بیلی نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔

"سیکٹری نہیں ـــ سیکرٹری کہو ـــ سیکرٹری رکھتے ہو تو اس کے بلانے کا طریقہ بھی سیکھو ـــ"

وہ گھور کر دیکھنے لگا۔ پھر ماؤتھ پیس پر اس نے کہا۔

"ہیلو ڈیڈی ـــ سیکٹری کہا جاتا ہے یا سیکرٹری ـــ؟"

وہ دوسری طرف سے جواب سننے لگا۔

جواب وہی تھا جو بیلی بتا چکی تھی۔ اب وہ گھورنے کی بجائے اسے دیکھ کر ہونٹ بھینچنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"میں نے یہاں ایک لڑکی کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔ وہ بڑی افلاطون بنی ہے۔ کہتی ہے کہ میں کسی کی نوکری نہیں کرتی۔ کیسے نہیں کرے گی۔ ڈیڈی؟ اب میں اسے یہاں سے جانے نہیں دوں گا!"

وہ خاموش ہو کر دوسری طرف سے باتیں سننے لگا۔ شاید سیٹھ مکرم

پریشانی کا اظہار کر رہے تھے۔

معظم ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"کسی کو بند کرنا جرم ہے یا نہیں — میں کچھ نہیں جانتا، میں لیسے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ جی اس کا نام — اس کا نام لیلیٰ مجنوں نہیں فرزانہ لیلیٰ ہے — پورا نام ؟ — پورا نام نہیں معلوم ہے۔ پوچھ کر بتاتا ہوں —"

اس نے لیلیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

تمہارا پورا نام کیا ہے۔

"ریسیور مجھے دو — " وہ بولی" میں ان سے بات کر دوں گی۔

وہ فون اٹھا کر اس کے قریب آتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں — اچھا"

اس نے کھڑکی کی جالی سے ریسیور لیلیٰ کی طرف بڑھا دیا۔

وہ ریسیور کان سے لگا کر کہنے لگی —

"ہیلو — میں لیلیٰ طاہر بول رہی ہوں۔

دوسری طرف سے ایک گہری سانس چھوڑنے کی آواز آئی۔ پھر سیٹھ مکرم نے،

"نان سینس! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ملازمت تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ کہو اب کیا خیال ہے۔؟

لیلیٰ نے جواب دینے سے پہلے معظم کی جانب دیکھا وہ اس کے سامنے ملازمت کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی لہذا اس نے انگریزی میں کہا۔

"وی بیٹر اسپیکنگ ان انگلش — میں نہیں چاہتی کہ آپ کے

صاحبزادے میری گفتگو کو سمجھیں — سر! اب تک آپ کو یہ بھی تجربہ ہو چکا ہوگا۔ کہ آپ کے صاحبزادے ملازمہ کو ایک خریدی ہوئی چیز سمجھ کر حاکم بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی گورنس یہاں رہنے نہیں پاتی — لیکن میں یہ غلطی نہیں کروں گی۔ آپ اپنے صاحبزادے کو سمجھا دیں کہ لیلیٰ طاہر دوست بن کر رہ سکتی ہے۔ ملازمہ بن کر نہیں رہ سکتی —"

"بہت مشکل ہے لڑکی — " سیٹھ مکرم کی آواز آئی۔ تم وہاں دوست بن کر بھی نہیں رہ سکو گی —"

"کیوں نہیں رہ سکتی۔ ؟" لیلیٰ نے جواب دیا۔

"میری کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ آپ کے صاحبزادے دوسروں کو دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ لیکن مجھے یہاں جبراً رکھنا چاہتے ہیں —"

فون پر تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شاید سیٹھ مکرم سوچ میں پڑ گئے تھے۔

لیلیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ انٹرویو کے دوران آپ میری باتوں میں کس طرح دلچسپی لے رہے تھے۔ یہی دلچسپی آپ کے صاحبزادے بھی لینے لگے ہیں — سر! اپنی باتوں میں گم کر دینے کا سلیقہ کسی کسی کو آتا ہے میں باتوں ہی باتوں میں معظم سے آپ کی فیملی کے وہ سارے حالات معلوم کر چکی ہوں۔ جس کے بعد اس معصوم اور ضدی بچے کی نفسیاتی کمزوریاں اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہیں۔

"نان سنس! تم واقعی ذہین ہو ۔ اچھا،

وہیں ٹھہرو! میں خود وہاں آرہا ہوں ۔ ریسیور معظم کو دیدو"

اس نے ریسیور معظم کو دے دیا۔ وہ کان سے لگا کر پوچھنے لگا۔

ہیلو ڈیڈی ۔ ! یہ آپ سے انگریزی میں کیا کہہ رہی تھیں۔

اچھا ۔ اچھا۔ آپ خود آرہے ہیں۔ اور آپ اچھے ڈیڈی ہیں۔ بس آپ یہاں آکر انہیں سمجھادیں کہ یہ یہاں سے نہ جائیں ۔ اچھا

بات ختم کرتے ہوئے اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اور لیلیٰ سے مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"ڈیڈی نے کہا ہے کہ وہ تمہیں یہاں رہنے پر مجبور کردیں گے۔

وہ بھی مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔

"اگر مجبور کرنے کے باوجود میں یہاں نہ رہوں تو ۔ ؟ کیا ابھی تمہارے ڈیڈی نے یہ نہیں کہا ہے کہ کسی کو زبردستی بند کرنا جرم ہے!

معظم کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس نے عاجز آکر پوچھا"

"آخر تم اتنی ضدی کیوں ہو ۔ ؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

"میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ جو لڑکے نیک ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کی عزت کرتے ہیں، میں بھی ان کی عزت کرتی ہوں۔

میں یہاں رہ سکتی ہوں۔ لیکن دوست بن کر ۔ ملازمہ بن کر نہیں ۔!

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ خالی۔ خالی نظروں سے لیلیٰ کو

تکنے لگا۔

اس وقت وہ اپنے چہرے سے اور اپنی آنکھوں سے مغرور معظم نہیں بلکہ معصوم بھولا نظر آرہا تھا۔

جگ نما گلاسوں میں پھلوں کا جوس لبالب بھرا ہوا تھا۔ اور ان گلاسوں کے آس پاس سیٹھ مکرّم، لیلیٰ اور معظم بیٹھے ہوئے تھے۔

معظم خاموش بیٹھا ہوا ان کے چہروں کو تک رہا تھا۔ چہروں کو اس لیے تاک رہا تھا کہ انگریزی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

آخر اس نے اکتا کر اپنا گلاس اٹھا لیا۔ اور آہستہ آہستہ جوس کی چسکی لینے لگا۔

لیلیٰ کہہ رہی تھی۔

جناب ۔ ! آپ نے میری ذہانت کی تعریف کی ہے۔ حالانکہ اس میں ذہانت کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر آپ پہلے کسی بھی گورنس کو اپنے خاندانی حالات سے آگاہ کر دیتے تو وہ یقیناً معظم کے سوچنے کے انداز کو سمجھ لیتی۔ اور یہاں سے ناکام ہوکر نہ جاتی۔"

سیٹھ مکرم نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے معظم کے متعلق کیا رائے قائم کی ہے۔؟"

"میں نے اب تک یہی سمجھا ہے کہ معظم احساس کمتری کا شکار ہے اپنے غریب نانا کے گھر سے نکل کر یک بیک اتنی عالی شان کوٹھی میں ایک عالی شان زندگی نصیب ہو گئی ہے۔ بڑی عمر کے لوگ بھی یک بیک دولت مند ہو کر اترانے لگتے ہیں۔ پھر معظم کیوں نہ مغرور ہوتا۔ وہ ملازموں پر حکم چلا کر ان پر زیادتیاں کر کے خود کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ بڑا آدمی ہے۔"

"بڑا آدمی بننا اور بات ہے۔" لیلیٰ نے جواب دیا۔ "لیکن بڑا آدمی بن کر دوسروں کو کمتر اور ذلیل سمجھنا بہت ہی غیر مناسب بات ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ نے خود ہی بیٹے کو مغرور بنایا ہے۔"

"نان سنس! تم مجھے الزام دے رہی ہو؟"

"میں نے جو معظم کی زبان سے سنا ہے وہی کہہ رہی ہوں کیا آپ نے اس سے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ اپنی دولت سے دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہے۔"

"ہاں میں نے کہا ہے اور محض اس لیے کہا ہے کہ اب وہ خود کو غریب نہ سمجھے، جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو۔ مجھ سے یا سیکرٹری سے روپے طلب کرے،"

لیلیٰ نے کہا۔

آپ نے روپے کے ذریعہ ہر چیز خریدنے کا طریقہ بتا دیا۔ لیکن وہ

انسانوں کو بھی خریدنا چاہتا ہے۔ بچوں کو اگر چلنے کے لیے کہا جائے وہ دوڑنے لگتے ہیں۔

اگر آپ اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھتے تو شاید وہ اس حد تک آگے نہ بڑھتا۔ ایک شاندار کوٹھی کو دنیا جہان کے کھلونوں سے سجا کر آپ نے سمجھ لیا کہ بیٹے کی پرورش شاہانہ انداز میں ہو جائے گی۔"

سیٹھ مکرم نے اس کی بات کاٹ کر ناگواری سے کہا۔

"لڑکی —! کوئی مجھ سے بات کرنے کی جرائت نہیں کرتا۔ اور تم مجھ پر طنز کر رہی ہو۔؟"

لیلیٰ نے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

"سچی بات کو آپ طنز نہ سمجھیں میں جو کچھ کہہ رہی ہوں۔ اس کا ثبوت بھی پیش کر رہی ہوں۔"

"ہم۔ !" انہوں نے غرا کر کہا۔ "تو پھر ثبوت پیش کرو۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

لیلیٰ نے بڑے ہی سکون سے ان کی جانب دیکھا اور کہنے لگی۔

"میں ابھی کہہ رہی تھی کہ آپ اپنے بیٹے کو یہ آرام عیش دے کر مطمئن ہو گئے ہیں۔ لیکن۔ آپ یہ نہیں جانتے کہ ملازموں کے درمیان رہ کر اس کی تربیت کتنے غلط انداز میں ہو رہی ہے۔ وہ بارہ سال کا لڑکا ابھی سے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کی عشقیہ داستانیں سنتا ہے اور فخریہ انداز میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ کیا شریف آدمیوں کے بچے ایسی داستانیں سن کر پرورش پاتے ہیں۔"

سیٹھ مکرم پریشان ہو کر صوفہ پر پہلو بدلنے لگے۔ اور کبھی لیلیٰ اور کبھی

معظم کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگے۔

لیلیٰ کی رپورٹ سن کر انہیں یک بیک خیال آگیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے معظم فون پر ان سے باتیں کر رہا تھا اور لیلیٰ کا نام بتاتے وقت بے خیالی میں "لیلیٰ مجنوں" کہہ گیا تھا۔

انہوں نے غصہ میں معظم کو مخاطب کرنے کے لیے اس کی جانب رخ کیا۔ لیکن لیلیٰ نے فوراً ہی مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے۔ معظم سے ایسی باتیں پوچھنا مناسب نہیں ہے۔ میری باتوں کی صداقت کا یقین کرنے کے لیے آپ براہ راست اس آپا کو تنہائی میں بلا کر پوچھیں۔"

"تنہائی میں کیوں؟" انہوں نے کہا۔ "میں ابھی یہاں بلا کر پوچھتا ہوں۔"

"اس کا نتیجہ کیا ہوگا آپ جانتے ہیں۔؟" لیلیٰ نے کہا۔ "اگر معظم کو یہ معلوم ہوگیا کہ اتنی دلچسپ کہانیاں سنانے والی آپا کو میری وجہ سے ڈانٹ پڑی۔ تو وہ میرا دشمن بن جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی موجودگی میں کچھ نہ کہے۔ لیکن غیر موجودگی میں مجھ سے بھی وہی سلوک کرے جو اب تک دوسری گورنس وغیرہ سے کرتا آیا ہے۔"

"ہم ۔۔۔!"

وہ یک بیک اٹھ کھڑے ہوگئے۔ معظم نے بھی اٹھنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"تم بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

پھر انہوں نے لیلیٰ سے کہا۔

"تم جوس کیوں نہیں پی رہی ہو۔ پک اِٹ اینڈ انجوائے اِٹ، اِٹ لسٹ ڈرنک ۔۔۔۔۔۔!"

یہ کہتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم سے باہر چلے گئے۔ لیلیٰ جوس کا گلاس اٹھا کر پینے لگی۔

معظم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم عیسائی ہو۔۔۔"

"نہیں تو۔۔۔!" وہ بولی۔

"پھر انگریزی میں باتیں کیوں کرتی ہو؟"

وہ ہنستی ہوئی کہنے لگی۔

"تمہارے ڈیڈی بھی تو انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ کیا وہ بھی عیسائی ہوگئے؟"

وہ لاجواب ہو کر خاموش رہ گیا۔

لیلیٰ اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

"انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے۔

بین الاقوامی سمجھتے ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یعنی وہ زبان جو کم و بیش دنیا کے تمام ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کا سیکھنا فائدہ مند ہے۔ خاص کر تم جیسے رئیس زادوں کے لیے ۔۔۔ کیونکہ تم اپنی دولت کے بل پر دنیا کے سرے سے دوسرے سرے تک جا سکتے ہیں۔ اور ساری دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو۔"

معظم نے خوش ہو کر پوچھا۔

"کیا میں ساری دنیا کی سیر کر سکتا ہوں؟

ہاں۔ کیوں نہیں؟ جب تم اس ملک سے باہر نکلو گے۔ تب تمہیں پتہ چلے گا کہ اس دنیا میں کیسی کیسی عجیب عجیب چیزیں ہیں۔ کیا تم نے ایسی ریل گاڑی کا ذکر سنا ہے جو زمین کے اندر چلتی ہے۔

"زمین کے اندر ——؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں انگلینڈ میں ایسی گاڑیاں ہیں۔ انہیں ٹیوب کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ کیا تم نے ایسی مشین دیکھی ہیں جس میں سکہ ڈالو تو اپنی پسند کا کھانا برآمد ہو جاتا ہے۔ اپنے جوتے رکھو تو وہ آپ ہی آپ پالش ہو کر چلے آتے ہیں ——"

معظم حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا رہا تھا۔

اس نے جوشیلے انداز میں اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔

"میں یہ تمام چیزیں ضرور دیکھوں گا۔

بیلی مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔

"لیکن دنیا کے یہ عجائبات دیکھنے کے لیے تمہارے پاس تین چیزوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ پہلی چیز دولت ہے۔ جو تمہارے پاس ہے۔ دوسری چیز انگریزی زبان ہے جس کے ذریعہ تم کسی بھی ملک میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہو۔ اور تیسری چیز تہذیب ہے۔ اگر تم اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا سلیقہ نہیں سیکھو گے تو باہر والے یہی کہیں گے کہ پاکستانی بچے تہذیب نہیں جانتے۔

وہ بڑی سنجیدگی سے بیلی کو دیکھنے لگا۔ وہ کچھ اسی قسم کا لڑکا تھا کہ اگر کوئی

خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی تو اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے مچل جاتا تھا۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اور تو سب ٹھیک ہے۔ مگر یہ انگریزی زبان میرے پلے نہیں پڑتی"

"سیکھنا چاہو گے تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں دو سال میں تمہیں اتنی انگریزی سکھا دوں گی کہ تم فر فر بولنے لگو گے۔

"دو سال ——!" اس نے حیرت سے کہا۔ "دو سال تو بہت ہوتے ہیں!"

علم بڑھاپے میں بھی سیکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے سال اور مہینے کی قید نہیں ہوتی۔ اور ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے سیکھتے سیکھتے تمہیں ایک عرصہ لگ جائے گا۔ اب یہی دیکھو نا کہ ہمارے درمیان بیٹھ کر جوس پی رہے ہو۔ اور پیتے وقت سڑ سڑ کی آواز کر رہے ہو ——"

"واہ، یہ بھی کوئی بات ہے؟" اس نے کہا "پیتے وقت ضرور آواز ہوتی ہے۔"

"نہیں —— یہ دیکھو ——"

وہ اپنے گلاس سے چسکیاں لیتے ہوئے جوس پینے لگی، پیتے وقت ایک ذرا سی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ معظم نے کہا۔

"آواز ہونے یا ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو پینے والے کی مرضی ہے۔ وہ جس طرح پیئے ——"

"ہاں تم اگر سر میں تیل نہ ڈالو۔ کنگھی نہ کرو۔ سلیقہ سے کپڑے نہ پہنو

تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ کیا تم نے کبھی ہپی لڑکوں کو دیکھا ہے جو غلاظت کا اشتہار بنے پھرتے ہیں۔؟

ہاں کئی بار کوٹھی کے سامنے سے گذرتے ہوئے دیکھا ہے وہ مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔

"اس طرح تم بھی مہذب انسانوں کے طور طریقے نہیں سیکھو گے تو لوگ تمہیں بھی اچھا نہیں کہیں گے۔

وہ سر جھکا کر پھر سوچنے لگا۔

اتنے میں سیٹھ مکرم ڈرائنگ روم میں واپس آگئے۔ انہوں نے آتے ہی لیلی سے پھر انگریزی میں کہا۔

"تم سچ کہہ رہی تھی۔ وہ نامعقول آیا اسے عشق و محبت کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ میں نے ہمیشہ کے لیے اس کی چھٹی کر دی ہے۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔

لیلی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھر بڑے ہی دکھ سے کہنے لگی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اسے ملازمت سے نکال دیں گے۔ ہم اسے سمجھا بھی سکتے تھے کہ آئندہ وہ اس قسم کی حرکتیں نہ کرے۔"

"نان سنس — ! میں غلط قسم کی عورتوں کو اپنے ہاں برداشت نہیں کر سکتا۔ تم اس کا ذکر ختم کرو۔ اور میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے معظم کو ملازموں کی نگرانی میں چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے۔"

لیلی نے جواباً کہا۔

"صرف غلطی محسوس کرنے سے کچھ نہیں ہونا۔ آپ کو اس غلطی کی تلافی بھی کرنی چاہیئے۔"

"اگر آپ میری بات مانیں تو میں یہی کہوں گی کہ معظم کو اب تنہا نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ آپ اسے اپنے ساتھ رکھیں تو بہتر ہے۔

"اپنے ساتھ — !" وہ کچھ پریشان سے ہو گئے۔

لیلی سوچ رہی تھی کہ شاید وہ کچھ کہیں گے۔ لیکن وہ کسی تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے۔

"کیا بات ہے — ؟" لیلی نے پوچھا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"میں فی الحال معظم کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا — میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تم یہاں رہنے لگو گی۔ تو رفتہ رفتہ تمہیں تمام باتیں معلوم ہو جائیں گی،" پہلے تو تم یہ فیصلہ کرو کہ تمہیں یہ ملازمت پسند ہے کہ نہیں — اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ معظم فی الحال میرے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتا۔

"میں نے پہلے ہی دن اپنا فیصلہ سنا دیا تھا — میں ضرورت مند ہوں اور مجھے اس ملازمت کی اشد ضرورت ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں یہ بے حد ضروری ہے کہ معظم کو اس ملازمت کا علم نہ ہونے پائے۔

"ہم — !"

انہوں نے معظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"معظم — !" میں ابھی لیلی کو سمجھا رہا تھا کہ وہ تمہاری گورنس بن کر یہاں رہے۔ لیکن یہ ملازمت نہیں کرنا چاہتیں۔ ہاں، مگر ایک شرط پر یہاں رہ سکتی ہیں۔"

"ڈیڈی ۔ اکوئی بھی شرط ہو، میں ان سے انگریزی سیکھنا چاہتا ہوں
یہ کہہ رہی تھیں کہ ساری دنیا کی سیر کرنے کے لیے یہ زبان ضرور سیکھنا چاہیئے۔

سیٹھ مکرم تعریفی نظروں سے لیلیٰ کو دیکھنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا لڑکا پڑھنے لکھنے سے کتراتا ہے۔ اور گورنس بن کر آنے والی عورتوں کا دشمن بن جاتا ہے۔

لیکن لیلیٰ سے آج پہلی ہی ملاقات میں وہ تعلیم سے دلچسپی لینے لگا تھا۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔

"جس دن تم اچھی طرح پڑھنے لکھنے لگو گے۔ اسی دن میں تمہیں انٹرنیشنل پاسپورٹ بنوا کر دوں گا۔ تاکہ تم تمام دنیا کی سیر کر سکو۔

لیکن اس کے لیے یہ شرط ضروری ہے کہ تم لیلیٰ کی دل سے عزت کرو۔ اور اس کی ہر بات کو بغیر کسی حیل و حجت کے تسلیم کر لیا کرو۔

بیٹے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم دولت سے ہر چیز خرید سکتے ہو۔ لیکن میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم انسانوں کو بھی خرید سکتے ہو اور انہیں ملازم بنا کر ان سے ناروا سلوک کر سکتے ہو۔

آج سے یہ بات تم اچھی طرح سے یاد رکھنا کہ تم بڑے باپ کے بیٹے ضرور ہو۔ لیکن لیلیٰ سے بڑے نہیں ہو۔ اور نہ ہی کبھی تم اس پر حکم چلا سکتے ہو۔

تم اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو گے نا۔؟

معظم نے نظریں اٹھا کر لیلیٰ کی جانب دیکھا۔

اب اس لڑکے کے چہرے پر پہلی جیسی سختی اور آنکھوں میں مغرورانہ چمک نہیں تھی۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔

"جی ۔ بہت اچھا ۔"

سیٹھ مکرم نے اطمینان کی سانس لے کر لیلیٰ سے پھر انگریزی زبان میں کہا۔

اب میں تمہیں بتاتا ہوں ۔ آج سے آٹھ سال پہلے میں نے دوسری شادی کی تھی۔ کل تم جس کوٹھی میں گئی تھیں۔ وہاں میری بیوی اور اس کے میکے والے رہتے ہیں۔

لیلیٰ نے تعجب سے کہا۔

"میں نے تو وہاں کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

وہ گرمیوں کا سیزن گزارنے کے لیے مری گئے ہوئے ہیں، میں مختصر طور پر اتنا ہی بتا دینا کافی سمجھتا ہوں۔ کہ میری بیوی یعنی معظم کی سوتیلی ماں یہ نہیں چاہتی کہ معظم میری جائیداد کا وارث بنے۔ لہٰذا وہ میرے بیٹے کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے سوتیلی ماں کے سائے سے دور رکھتا ہوں۔"

لیلیٰ نے تھکے ہوئے انداز میں صوفے کی پشت پر سر ٹیک دیا۔

واقعی اس لڑکے کے پیچھے بہت سی عجیب و غریب کہانیاں تھیں جو ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ رہی تھیں۔

وہ پارک کے ایک گوشہ میں بیٹھی ہوئی عاصم کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ وقت سے پہلے ہی آجایا کرتا تھا۔ لیکن آج لیلیٰ وقت سے پہلے آگئی تھی۔ اور اسے وہاں نہ پاکر دل ہی دل میں اس سے روٹھ جانے کا ارادہ کر رہی تھی۔

محبت میں روٹھ جانے کی ادا بڑی ہی اہم ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے روٹھ جانے اور ایک دوسرے سے من جانے میں پیار کے حسین جذبوں کا احساس ہوتا ہے۔ انہیں صرف محبت کرنے والے دل ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

لیلیٰ ان لطیف جذبوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ جب عاصم اس سے شادی کا ذکر کرتا۔ اور وہ موجودہ مشکلات کے تحت انکار کر دیتی تو عاصم اس سے اکثر روٹھ جایا کرتا تھا۔ پھر اسے مناتے وقت اس کی خوشامدیں کرتے وقت اسے ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے وہ تنہا عاصم کو نہیں منا رہی ہے۔ بلکہ اپنی روٹھی ہوئی زندگی کی خوشامدیں کر رہی ہے۔ اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کو سنوار رہی ہے۔ خدا روٹھ جاتے تو انسان سجدے کرتا ہے مرد روٹھ جاتے تو عورت اپنا تن من سب کچھ وار دیتی ہے۔

عاصم کی طرح لیلیٰ کو کبھی روٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج اسے موقع

رہا تھا۔ آج ایسے وقت جب وہ ملازمت کے سلسلہ میں ایک بڑی خوشخبری سنانے والی تھی۔ تو وہ موجود نہیں تھا— آج اس نے شکایت کا موقع دے ہی دیا تھا۔

عاصم وقت سے پہلے تو نہیں آیا۔ مگر وقت مقررہ پر ضرور پہنچ گیا۔

لیلیٰ روٹھنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ لیکن اس کا حلیہ دیکھتے ہی وہ ساری ناراضگی بھول کر رہ گئی۔

اس کے سر کے سوکھے بال الجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی دنوں سے اسے تیل اور کنگھی نصیب نہیں ہے۔ چہرے پر شیو بڑھا ہوا تھا۔ اور ان کی آنکھوں سے وحشت جھلک رہی تھی۔ وہ عاصم کو جو ہمیشہ ڈرائی کلین کے صاف ستھرے کپڑے پہنا کرتا تھا آج اس کے کپڑے جابجا شکن آلود اور گرد سے اٹے ہوئے نظر آرہے تھے

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"

عاصم اسے دیکھ کر جبراً مسکرانے لگا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیلیٰ! ذرا مصروفیتوں کی وجہ سے حلیہ بگڑ گیا ہے۔"

وہ پارک کے بنچ پر تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔

لیلیٰ اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور اسے پریشانی سے تکنے لگی

عاصم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

آؤ بیٹھو ـــ میں اس حالت میں کبھی یہاں نہ آتا، میں جانتا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گی۔ لیکن کیا کروں؟ شیو بنانے، غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے میں اتنا وقت گزر جاتا کہ تم انتظار کرتے کرتے یہاں سے چلی جاتی۔ پھر یہاں آ کر کسے دیکھتا۔

یہ پارک ـــ یہ ہریالی ـــ یہ کھلے ہوئے پھول میری نگاہوں کی پیاس نہیں بجھا سکتے میں اپنا حلیہ بگاڑ سکتا ہوں۔ لیکن دیدار کے ان لمحوں کو نہیں گنوا سکتا ـــ"

لیلیٰ نے فرطِ محبت سے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔ پھر کہنے لگی۔ آپ کس سلسلے میں مصروف ہیں۔؟ آپ کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ تمام دن پریشان رہے ہیں۔

وہ لیلیٰ کے گورے اور ملائم ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے اور ان ہاتھوں کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کہنے لگا۔

لیلیٰ ـــ! ہم گھڑی دو گھڑی کے لیے یہاں آ کر ملتے ہیں اس لیے پریشانیوں کا ذکر نہ کرو۔ مصیبتوں سے کس طرح لڑنا چاہیئے۔ یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں۔ تم اپنی بات بتاؤ کہ ملازمت کا کیا بنا؟

"مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ یہی خوشخبری سنانے کے لیے آج میں وقت سے پہلے یہاں چلی آئی تھی۔ کتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

عاصم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"آج تم نے بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ تنخواہ تو یہی پانچ سو روپے ہے نا؟

"ہاں۔ تنخواہ تو یہی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے کھانے پینے، گھومنے پھرنے، اور پہننے اوڑھنے کے تمام اخراجات سیٹھ مکرم پورے کریں گے۔ مثلاً میرے لیے ایک لیڈی ٹیلر بلوائی گئی ہے میرے لیے مختلف رنگوں اور مختلف ڈیزائنوں کے لباس تیار کرے گی۔ کم از کم بیس جوڑے تیار رہیں گے۔

"اوہو، ہو ـــ پھر تو تم کسی ریاست کی شہزادی نظر آؤ گی ـــ"

اس نے شرارت سے قریب جھکتے ہوئے کہا۔

"اتنی بلندی پہ پہنچ کر کہیں مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی؟"

لیلیٰ کے دل میں چوٹ سی لگی۔ وہ بڑے ہی دکھ سے اسے دیکھنے لگی عاصم کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اسے شرارت سے بھی یہ بات نہیں کہنا چاہیئے۔ لیکن زبان تھی۔ پھسل گئی۔

لیلیٰ نے سر جھکا کر ہولے سے کہا

"ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ میں یہ ملازمت چھوڑ سکتی ہوں۔"

کیوں ـــ؟ اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جو بلندی میری محبت کو شبہ میں مبتلا کر دے، میں اس بلندی تک نہیں جانا چاہتی ـــ"

عاصم نے مسکرا کر کہا۔

لیکن وہ روٹھ گئی۔ روٹھنے کا بہانہ تو وہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اس لیے وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

عاصم کو اس کے روٹھنے کی ادا بہت پیاری لگی۔ گھوم کر بیٹھنے کی وجہ

سے اس کی سفید اور اجلی گردن اس کے قریب آگئی تھی۔ اس نے ہولے سے گردن کی چکیلی سطح پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

لیلیٰ —

وہ اس پیار بھرے لمس سے کانپ گئی۔

ہائے — ہا" روٹھا بھی نہیں جاتا۔ ہاتھوں کا ایک مختصر سالمس اپنی طرف کھینچے لیتا ہے —"

عاصم نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

وہ گھبرا سی گئی۔

"ہائے! چھوڑیئے، کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟

چھوڑ دوں گا۔ پہلے سیدھی طرح کہو کہ ناراض نہیں ہو۔

نہیں ہوں۔ نہیں ہوں۔ خدا کے لیے چھوڑ دیجیے —"

عاصم نے اسے گرفت سے آزاد کر دیا۔

وہ سانسیں درست کرتی کہنے لگی۔

"توبہ ہے آپ ذرا بھی خیال نہیں کرتے ہیں۔ اب میں یہاں نہیں ملوں گی۔

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ ایسی حرکتیں نہیں کریں گے۔

عاصم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا وعدہ کرتا ہوں۔"

"آپ مجھ سے شادمان کالونی میں آکر ملا کریں۔ کل سے مجھے وہیں رہنا پڑے گا۔

اور تمہاری امی کہاں رہیں گی؟

لیلیٰ نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

"اب ان ہی کی فکر رہ گئی ہے۔ اس مہینے کی آخر تک ان کی شادی کر دوں گی۔ کم از کم اس وقت تک انہیں تنہا ہی رہنا پڑے گا۔ پڑوسن سے میں نے کہہ دیا ہے کہ رات کے وقت وہ اپنے بچوں کو امی کے پاس سلا دیا کرے۔ دن کے وقت میں ان سے جا کر مل لیا کروں گی۔ مجھے آنے جانے کے لیے معظم کی کار استعمال کرنے کی آزادی ہے۔

"معظم کون —؟"

"وہی سیٹھ مکرم کا لڑکا۔ آپ نے تو کار بیچ دی ہے نا؟"

نہیں — بیچنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ میں نے کوٹھی بیچنے کا ارادہ بھی ترک کر دیا ہے۔ انہیں بیچ کر جو رقم مجھے ملے گی۔ اتنی رقم تو میں اپنے ماموں سے بھی قرض لے سکتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" "پھر قرض کیوں نہیں لیتے —؟"

ماموں نے کہا ہے کہ میں ابا سے الگ ہو کر تنہا کاروبار کروں تو مجھے جتنی رقم کی ضرورت ہو گی وہ فوراً مل جائے گی۔

"آپ کے ماموں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ آپ کے ابا نے آپ کی جائداد اور کاروبار کو کس طرح تباہ کیا ہے۔ یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔"

ہاں — اچھی طرح جانتا ہوں، میں بہت جلد ان سے فیصلہ کرنے والا ہوں —"

لیلیٰ نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یقیناً جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ جتنی جلدی آپ اپنا

کاروبار کریں گے۔ اور اپنی موجودہ پریشانیوں سے نجات حاصل
کریں گے۔ اور اتنی ہی جلدی ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ میں تو کسی
حد تک کامیاب ہو چکی ہوں۔ اب آپ ہی کا انتظار ہے۔

"یہ انتظار طویل نہیں ہوگا۔ بیلی ــــ!"
عاصم نے محبت اور عزم سے اس کے ہاتھ کو بھینچتے ہوئے کہا۔
میں بہت جلد تمہیں خوشخبری سناؤں گا۔
یہ خوشخبری محض میری زبان سے نہیں۔
شہنائی کی میٹھی تان سے ابھرے گی۔
اور سہرے کے پھولوں سے مہکتی ہوئی اس سیج پر آئے گی۔ جہاں تم
دلہن بنی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔
"میں نے بہت دنوں سے خوشیوں کا چہرہ نہیں دیکھا ہے۔ بیلی!
وہ چہرہ بہت جلد تمہارے گھونگھٹ کی اوٹ سے طلوع ہوگا۔
بہت جلد ــــ"
وہ سر جھکا کر شرما رہی تھی۔
خیالی شہنائیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔
سہرے کے پھول اس کے سانسوں میں گھل رہے تھے۔ اور اس
کا نرم و نازک سا ہاتھ عاصم کے ہاتھوں میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔
آہ ــــ! محبت کے خواب کتنے سہانے ہوتے ہیں؟
کل کیا ہونے والا ہے؟ کتنی رکاوٹیں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔
انہیں اس کی خبر نہیں تھی ــــ وہ آج کے بہلاوے سے بہل رہے تھے۔

سیٹھ مکرم کے چیمبر میں بیلی، نسیمہ اور عاصم بیٹھے ہوئے تھے۔
سیٹھ مکرم نے بیلی سے کہا تھا کہ وہ ملازمت کے سلسلہ میں مزید کچھ
ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان باتوں کے دوران اس کے
بزرگوں کا یا سرپرستوں کا یا پھر ایسے فرد کا موجود ہونا ضروری ہے
جو بیلی سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتے ہوں۔
اسی لیے بیلی اپنے ساتھ نسیمہ اور عاصم کو لے کر آئی تھی۔
نسیمہ کو اس لیے ساتھ لائی تھی کہ وہ بزرگ بھی تھی۔ اور اس سے
گہرا اور قریبی تعلق بھی تھا۔ اور عاصم کو اس لیے ساتھ لائی تھی کہ وہ اس
کے مستقبل کا مالک و مختار بننے والا تھا۔
تھوڑی دیر بعد سیٹھ مکرم چیمبر میں داخل ہوئے انہیں دیکھتے ہی بیلی
آداب کہتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ نسیمہ اور عاصم نے بھی اٹھ کر ان کی
تعظیم کی۔

"بیٹھو ــــ بیٹھو ــــ!"
انہوں نے تینوں کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا اور
ان کے سامنے ایک بڑی سی میز کے پیچھے اپنی ریوالونگ چیئر پر خود آ کر
بیٹھ گئے۔

لیلیٰ نے نسیمہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ میری سسٹر ہیں۔ ان کے سوا دنیا میں میرا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کل میں نے ان ہی کی شادی کے متعلق آپ سے کچھ عرض کیا تھا۔"

نسیمہ شرم سے سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

سیٹھ مکرم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد تمہاری سسٹر کی شادی ہو جائے۔ تاکہ یہ اپنا گھر بسا لیں۔ اور تم مطمئن دل سے تمام فکروں سے آزاد ہو کر میرے بیٹے کی طرف دھیان دے سکو۔"

پھر انہوں نے عاصم کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"یہ تمہارے کون ہیں۔"

لیلیٰ جواب دینے کے بجائے نسیمہ کو دیکھنے لگی۔ وہ ماں کو سمجھا کر یہاں لائی تھی کہ سیٹھ مکرم پوچھیں تو نسیمہ اس کی طرف سے جواب دے گی۔

نسیمہ نے بدستور سر جھکائے ہوئے کہا۔

"جناب! ان کا نام محمد عاصم ہے۔ یہ میری منہ بولی بہن کے صاحبزادے ہیں۔ لیلیٰ سے اس کی نسبت طے ہو چکی ہے۔ میرے بعد یہی لیلیٰ کی زندگی میں اہمیت رکھتے ہیں۔"

سیٹھ مکرم کے ماتھے پر شکنیں پھیل گئیں۔

لیلیٰ کا سر حیا سے جھکا ہوا تھا۔ نسیمہ بھی نظریں جھکا کر بیٹھنے کی عادی

تھی۔ اور عاصم نے بھی وقتی طور پر اپنی شادی کے ذکر پر سر جھکا لیا تھا۔

تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ سیٹھ مکرم کے بدلے ہوئے تیور کو نہ دیکھ سکے۔

وہ بہت ہی گہری نظروں سے۔ اور بہت ہی تنقیدی نظروں سے عاصم کو دیکھ رہے تھے۔

پھر انہوں نے اخلاقاً عاصم سے کہا۔

"تم بہت خوش نصیب ہو کہ لیلیٰ جیسی ذہین لڑکی تمہاری شریک حیات بننے والی ہے۔

لیلیٰ نے اپنی ذہانت سے، اپنے کردار سے اور اپنے اصولوں سے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ پندرہ دن کے مختصر عرصہ میں اس نے میرے لڑکے کی کایا پلٹ دی ہے اب وہ ہر دم اس کے نام کی رٹ لگائے رہتا ہے۔ نہ اس کے بغیر کھاتا ہے نہ اس کے بغیر سوتا ہے۔

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ لیلیٰ نے اگر مستقل طور پر یہ ملازمت کی تو میرے بیٹے کی زندگی سنور جائے گی۔ اور وہ ایک اچھے کردار اور اچھی شخصیت کا مالک بن جائے گا۔

لہٰذا آج میں نے اسی لیے آپ لوگوں کو زحمت دی ہے کہ آپ لوگ یہاں بیٹھ کر لیلیٰ کی ملازمت کا فیصلہ کر لیں۔

ملازمت کے مستقل ہونے کے بعد لیلیٰ کی تنخواہ پانچ سو روپے کی بجائے ہزار روپے بھی ہو سکتی ہے۔"

ہزار روپے کی بات سن کر نسیمہ کا دم رکنے لگا۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی کہ اس کی بیٹی ہزار روپے ماہوار کمائے گی۔

سیٹھ مکرم نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کے فضل سے میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ میں اپنے بیٹے کی زندگی سنوارنے کے لیے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا سکتا ہوں۔ ملازمت مستقل ہونے کے بعد صرف یہی نہیں کہ لیلیٰ کو ہزار روپے ماہوار ملیں گے۔ اس کے علاوہ بھی جب کبھی اہم ضرورتوں کے لیے اسے پیسوں کی کمی ہوگی میں ہر ممکن اس کی مدد کروں گی۔

مثال کے طور پر لیلیٰ کو ابھی اپنی سسٹر کی شادی کے لیے روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے میں ابھی اور اس وقت پانچ ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ اس قسم کی امدادی رقمیں کسی کھاتہ میں نہیں لکھی جائیں گی۔ اور نہ ہی یہ روپے لیلیٰ کی تنخواہ سے کاٹے جائیں گے۔

لیلیٰ حیرت سے اور عقیدت سے انہیں دیکھتی جا رہی تھی۔ عاصم اپنی محبوبہ کی اس شاندار ترقی پر مسکراتا ہوا کبھی سیٹھ مکرم کو دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنی جان جبات کو—"

نسیمہ نے بھی عقیدت اور احسان مندی سے کہا۔ "آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں— آپ اس کی بھلائی کے لیے اتنا کچھ سوچ رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ بھی آپ کی زندگی بھر خدمت کرتی رہے گی—"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں زندگی بھر کے لیے لیلیٰ کی خدمت حاصل نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اسے شادی کے بعد اپنی گھریلو زندگی کو بھی سنوارنا ہوگا۔

شادی کے بعد لڑکیاں کچھ اس طرح گھر گرہستی میں الجھ جاتی ہیں کہ دوسروں کی خدمات کا انہیں موقع نہیں ملتا۔

لہٰذا اس ملازمت کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ لیلیٰ کی شادی کا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کی شادی زیادہ سے زیادہ کتنی مدت کے لیے روکی جا سکتی ہے۔

لیلیٰ اور عاصم ایک دوسرے کو پریشان نظروں سے دیکھنے لگے نسیمہ نے اپنے خیال کے مطابق جواب دیا۔

"لڑکیاں عزت و آبرو سے جتنی جلدی بیاہ کر رخصت کر دی جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔

"یہ بہت پرانا نظریہ ہے" سیٹھ مکرم نے کہا۔ "پہلے لڑکیاں کم عمری میں بیاہ دی جاتی تھیں۔ لیکن آج انہیں بی اے اور ایم اے پاس کرتے کرتے ۲۵ سال کا عرصہ گذر جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ لڑکیاں اتنی کم عمری میں شادی نہیں کرتیں— ہاں ایسی لڑکیاں جو والدین پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ ان کے متعلق جلدی شادی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ لیکن لیلیٰ کسی پر بوجھ نہیں ہے۔

لیلیٰ کے متعلق فیصلہ کرتے وقت یہ سوچنا ہوگا کہ ایسی ذہین لڑکی کیا صرف چار جماعتیں پڑھ کر رہ جائے گی— نہیں یہ اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ آپ لوگ چاہیں تو وہ معظم ولا میں رہ کر کالج میں داخلہ لے سکتی ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔

پھر انہوں نے عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"محبت ایک جذباتی چیز ہے۔ لیکن شادی زندگی کا اہم مسئلہ ہے اس

کا فیصلہ جذبات سے نہیں ذہانت سے کرنا چاہیئے۔

عاصم — ! میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ یہ مشورہ دینے میں میری کچھ غرض پوشیدہ ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اس میں تمہاری اور لیلیٰ کی بھلائی ہے۔

میری غرض یہ ہے کہ جب تک میرا لڑکا بیس، اکیس برس کا نہ ہو جائے۔ اور لیلیٰ کے ہاتھوں کسی حد تک قابل ہو کر کالج میں داخلہ نہ لے اس وقت تک لیلیٰ اپنی ساری توجہ اس پر صرف کرے اور شادی بیاہ خاوند اور بچوں کے جھمیلے میں نہ پڑے۔ اس دوران لیلیٰ کو معظم کے ساتھ ملک سے باہر بھی جانا ہو گا۔ تاکہ وہ قدم قدم پر میرے بیٹے کی گائڈ۔ گورنس — اور سرپرست بن کر رہ سکے۔

اس سلسلے میں تمہاری اور لیلیٰ کی بھلائی یہ ہے کہ طبی نقطہ نظر سے پچیس سال کی عمر شادی کے لیے بہتر ہو گی۔ اس وقت تک لیلیٰ اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکی ہو گی۔ اور تم بھی ایک تجربہ کار اور ذہین کاروباری بن چکے ہو گے۔

اب اس پہلو پر غور کرو کہ لیلیٰ کو مالی فائدہ کیا پہنچے گا۔؟

ماہانہ ایک ہزار روپے جو لیلیٰ کو ملیں گے۔ وہ کہاں خرچ ہوں گے — ؟ کہیں نہیں — کیونکہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اور کالج میں اپنی تعلیم حاصل کرنے کے تمام اخراجات معظم ولا سے پورے کیے جائیں گے۔ اتفاقی یا حادثاتی ضروریات کے لیے بھی تنخواہ کے علاوہ امداد ملا کرے گی — اس لیے ظاہر ہے کہ لیلیٰ جیسی ذہین لڑکی اپنی تنخواہ کی ایک ایک پائی بچاتی گی۔ میں نے حساب کیا ہے۔ تم لوگ بھی حساب کر کے دیکھو پچیس

برس کی عمر میں لیلیٰ کے پاس ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے جمع ہو جائیں گے۔!

یہ میرا وعدہ ہے کہ آج میں لیلیٰ کو بیٹی بنا کر معظم ولا میں لے جاؤں اس وقت لیلیٰ کی عمر سولہ برس کی ہے۔ آج سے ٹھیک نو سال کے بعد میں باپ بن کر اسے ڈولی میں بٹھا دوں گا۔ اور عاصم کی امانت جوں کی توں واپس کر دوں گا۔

یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور نسیمہ سے کہنے لگے

اور تم میرے ساتھ آؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ لیلیٰ اور عاصم کچھ دیر اس بارے میں تنہا رہ کر اپنے مستقبل کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کر لیں۔"

نسیمہ نے لیلیٰ کی جانب دیکھا۔ جیسے وہ جانے سے پہلے بیٹی سے اجازت لینا چاہتی ہو۔ لیکن پھر اس کی جھکی ہوئی نظریں دیکھ کر سمجھ گئی کہ لڑکے اور لڑکی کو اس اہم فیصلے کے لیے تنہا چھوڑ دینا ہی مناسب ہو گا وہ اٹھ کر چیمبر سے باہر جانے لگی۔

سیٹھ اکرم نے لیلیٰ کے قریب سے گزرتے ہوئے رک کر کہا۔

اور تم جانتی ہو لیلیٰ کہ معظم کے لیے میں اتنی دولت پانی کی طرح کیوں بہا رہا ہوں — یہ کروڑوں روپوں کی جائیداد کا معاملہ ہے۔ اگر معظم اس جائیداد کو سنبھالنے کے قابل نہ بن سکا — تو دشمن اس پر قابض ہو جائیں گے۔

تم نے اب تک ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ فیصلہ بھی تم ذہانت سے کرو گی۔

یہ کہہ وہ آگے بڑھ گئے۔
دروازے پر پہنچ کر انہوں نے ایک آخری نگاہ ان پر ڈالی پھر دروازہ
بند کرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

نو سال ۔۔۔!

نو سال کا عرصہ پلک جھپکتے بھی گذر سکتا ہے۔ اور اگر نہ گزرنا چاہے
تو منتظر نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہ جاتا ہے۔

محبت کرنے والوں کے لیے ایک پل بھی ایک صدی کے برابر
ہوتا ہے۔ پھر یہ نو سال کی طویل مدت کیسے گذرے گی۔؟

عاصم نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ابھی ہماری منزل بہت دور ہے۔۔۔"

لیلیٰ نہ معلوم کیسے ضبط کئے بیٹھی تھی۔ عاصم کا حسرت بھرا لہجہ سن کر
تڑپ گئی۔ یک بیک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑتی ہوئی آکر اس
کی آغوش میں گر پڑی۔

"میں نہیں کروں گی۔ میں یہ ملازمت نہیں کروں گی۔۔۔۔ میں
آپ سے دور نہیں رہ سکتی۔۔ مجھے زندگی کے فریب سے اور دولت
کے حصول سے بچا لیجئے۔ آپ میری زندگی کے مالک ہیں ۔۔۔ مجھے
کہیں دور لے جائیے۔۔۔"

وہ بے اختیار اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

عاصم خاموش بیٹھا رہا۔

جذبات آنسو بن جائیں تو ان کا بہہ جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ کم از
کم دل کا غبار چھٹ جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد آنسو آہستہ آہستہ تھمنے لگے۔ چیمبر کی محدود
فضا میں صرف ہلکی ہلکی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔

عاصم نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"لیلیٰ ۔۔۔! آزمائش کی گھڑیوں میں انسان کی ذہانت آزمائی جاتی
ہے۔

یہ فیصلہ دل سے نہیں دماغ سے کرو۔

اور اگر تمہارا ذہن ماؤف ہو گیا ہے تو پھر اس کا فیصلہ مجھ پر
چھوڑ دو۔۔۔"

لیلیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں

عاصم کی آنکھوں میں اداسی تھی۔

اور لیلیٰ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

وہ آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ فیصلہ تو آپ ہی کریں گے ۔ مجھے
آپ پر اعتماد ہے۔ آپ کبھی غلط فیصلے نہیں کرتے ہیں۔

عاصم نے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر کہا۔

"اتنی حسین مورت کو کس دل سے جدا کروں۔ دل تو یہی کہتا ہے کہ
میری لیلیٰ ہمیشہ میرے سینے سے لگی رہے۔

مگر لیلیٰ ۔۔۔! فرض کو بھول کر محبت کا دم بھرنا، سراسر خود غرضی
ہے۔

کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت سب سے پہلے تمہیں اپنی امی کے متعلق سوچنا
ہوگا۔۔۔ کیا تم ان کی شادی نہیں کروگی۔؟

وہ کش مکش میں مبتلا ہو گئی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔

عاصم نے کہا۔

"اپنی امی کی شادی کے بعد بھی تمہیں ایک اچھی اور محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت ہو گی۔

تم کہو تو میں آج ہی تمہیں دلہن بنا کر اپنے گھر لے جا سکتا ہوں۔

لیکن اس طرح ہم جذباتی طور پر ازدواجی زندگی تو حاصل کر لیں گے۔ مگر ایک شاندار مستقبل نہیں پا سکیں گے۔ بعد میں ہمیں احساس ہو گا کہ ہم نے جلد بازی کی ہے۔

یہ کتنی اچھی بات ہے کہ نو سال کے عرصہ میں تم اعلیٰ تعلیم حاصل کر لو گی۔

تمہارے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے جمع ہو جائیں گے۔ اور اس وقت تک کاروباری دنیا میں مجھے بھی اتنا تجربہ ہو جائے گا کہ پھر کوئی خدا بخش باپ بن کر مجھے دھوکہ نہیں دے سکے گا۔

انسان کو زندہ رہ کر بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی آزمائش ہے کہ نو سال کے عرصہ میں ہماری محبت کمزور پڑ جائے گی۔ یا اور شدید ہو جائے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی ہمیں ایک دوسرے سے چھین کر لے جائے گا۔

لیلیٰ نے اس کے سینے پر سر رکھ کر کہا۔

"نہیں ـــ خدا کی قسم لیلیٰ صرف آپ کی ہے۔ آپ سے کسی نے مجھے چھیننے کی کوشش کی تو اس سے پہلے ہی میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"تو پھر آؤ ہم اپنی محبت کی قسم کھا کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے

درمیان نو سال کی ایک لمبی دیوار کھڑی کر دیں۔

نو سال کے بعد جب یہ دیوار گرے گی تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری محبت آج سے بھی زیادہ شدید ہو گی۔ اس دنیا کی کوئی لڑکی تمہاری محبت پر ڈاکہ نہیں ڈال سکے گی۔

لیلیٰ نے بھی پورے اعتماد سے کہا۔

"میں بھی آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ نو سال کے بعد جب میں آپ کے پاس آؤں گی تو میرے دل میں پیار کی یہی پاکیزگی ہو گی۔ دنیا کی کوئی غلاظت اسے آلودہ نہیں کر سکے گی ـــــ خریدنے والے میری زندگی کے نو سال کو اور نو ہزار سال کو خرید سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اور میری محبت کو نہیں خرید سکتے۔"

عاصم نے اس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"زندگی کی کڑی دھوپ میں اب تمہاری زلفوں کا سایہ نہیں ہو گا لیکن تمہاری یادوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں یہ کڑی دھوپ بھی کسی طرح گزر جائے گی۔

یہ سچ ہے کہ ابھی محبت ایک سزا بن گئی ہے۔ لیکن اس سزا میں بھی انتظار کا مزہ ہے کہ میری محبوبہ جب بھی آئے گی۔ اپنی جلو میں دوشیزگی کی بہاریں لے کر آئے گی۔

لیلیٰ کے دھڑکتے ہوئے سینے سے ایک "ہائے" نکلی اور چیمبر کی ائرکنڈیشنڈ فضا میں تحلیل ہوتی چلی گئی۔

"ہائے ـــ آپ نے کتنی موزوں بات کہی ہے۔ محبت واقعی ایک سزا بن گئی ہے۔ آج سے میں نو سال کی سزا کاٹنے کے لیے معظم ولا کے جیل

خانہ میں جا رہی ہوں۔

لیکن جب اس جیل سے باہر آؤں گی۔ تو مجھے یقین ہے کہ تمہاری باہوں کا دروازہ میرے لیے کھلا ہو گا۔"

"میں تمہیں اپنی وفا کا یقین دلاتا ہوں۔ لیلیٰ! مرد اپنی زبان کی سچائی سے پہچانا جاتا ہے۔"

"میں بھی آپ کو اپنی حیا کا یقین دلاتی ہوں — عورت اپنی آنکھوں کی حیا سے پہچانی جاتی ہے۔"

وہ دونوں پیار کی مدہوشی میں اپنی وفا اور اپنی حیا کی قسمیں کھا رہے تھے۔ اور ایک دوسرے سے دور رہ کر جینے کے وعدوں اور قسموں کا سہارا لے رہے تھے۔

لیلیٰ کی محمل اٹھنے والی تھی۔ اور نو سال کے طویل ۔ تھکا دینے والے اور تپتے ہوئے ریگستان میں قیس اس کے محمل کے پیچھے بھٹکنے والا تھا۔"

بیوہ کی شادی میں شہنائیوں کی سریلی آوازیں نہیں گونجتیں۔ اور نہ ہی ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت گائے جاتے ہیں۔

نسیمہ کی شادی میں گانوں اور باجوں کا شور نہیں تھا لیکن شادی

کی چہل پہل ضروری تھی۔ محلے کی عورتیں بن بلائے آ رہی تھیں۔ اور جہیز کے سامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں۔

پلنگ، الماری، صوفہ سیٹ، چینی کے برتن، ریشمی اور کاٹن کے قیمتی ملبوسات اور سونے کے زیورات — زندگی کی ضروریات، گھر کی سجاوٹ اور جسم کی آرائش کا کونسا ایسا سامان تھا۔ جو ایک بیٹی نے اپنی ماں کے لیے نہیں خریدا تھا۔

اس شادی کے بہانے عاصم اور لیلیٰ کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ ایک ماہ کی جدائی کے بعد وہ ملے تو انہیں یوں لگا جیسے صدیوں کے بعد مل رہے ہیں۔ عاصم پہلے معظم ولا میں جا کر اسے دیکھ لیا کرتا تھا۔ جب سے سیٹھ مکرم کو ان کے ہونے والے رشتہ کا علم ہوا تھا۔ تب سے عاصم اور لیلیٰ نے معظم ولا میں ملنا جلنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

حالانکہ سیٹھ مکرم نے کھل کر ان کے میل جول پر اعتراض نہیں کیا تھا لیکن وہ اپنے ذہن سے سوچ سکتے تھے اور سمجھ سکتے تھے کہ شادی سے رکنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ نو سال تک ایک دوسرے سے دور رہیں — دوری سے محبت ختم نہیں ہو جاتی۔ لیکن شادی کی آرزو کسی حد تک سرد پڑ جاتی ہے۔

سیٹھ مکرم یہی چاہتے تھے کہ وہ دونوں حالات کے تحت سمجھوتہ کر کے اپنے درمیان اس حد تک فاصلہ قائم کر لیں کہ عشق محبت رہے۔ مگر محبت کی منزل تک پہنچنے کی تڑپ نہ رہے۔

لہٰذا وہ یہ فاصلہ قائم کرنے کے لیے اپنی اپنی زندگی کی جدوجہد میں

معروف ہو گئے تھے۔ لیکن نسیمہ کی شادی نے انہیں ایک دن کے لیے پھر ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔

لیلیٰ کو آج عاصم سے ملنے کی خوشی بھی تھی اور ماں سے خدا ہونے کا غم بھی — وہ باہر مردوں کی محفل میں آتی تو عاصم کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آتا — اندر عورتوں کی بھیڑ میں جاتی تو ماں کو گھونگھٹ میں دیکھ کر پرائی ہونے کا خیال ستاتا تھا۔

وہ چھوٹا سا مکان غریبی کے دور میں کرائے پر لیا گیا تھا۔ لیکن مکان کے اندر ہزاروں کا جہیز اور مکان کے باہر شامیانے اور قناتیں دیکھ کر اور ان کے قریب ستر ہزار کی شیورلٹ کار کو دیکھ کر لوگ لیلیٰ کی شخصیت سے متاثر نظر آ رہے تھے۔

معظم کی کار، یوں بھی لیلیٰ کے استعمال میں زیادہ رہتی تھی۔ لیکن آج وہ کار خاص طور سے لیلیٰ کو دیدی گئی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی گھر سے نکلتی تھی۔ اور عاصم کے ساتھ کار میں بیٹھ کر یوں ناز سے نکل جاتی کہ لوگ اس کی شان و شوکت کو دیکھتے ہی رہ جاتے۔

ریشمی لباس میں زیورات سے لدی پھندی ہوئی وہ لڑکی انہیں کسی ریاست کی شہزادی نظر آ رہی تھی۔

"میں نے ٹھیک ہی کہا تھا —"

عاصم نے کار کی تنہائی میں اس سے کہا۔

قیمتی لباس اور سونے کے زیورات پہن کر تم کسی ریاست کی شہزادی لگ رہی ہو۔

لیلیٰ نے مسکرا کر ایک ادا سے کہا۔

"اب آپ بھی مجھے بنانے لگے ہیں"

عاصم نے کار کے آئینے کا رخ اس کی جانب پھیر کر کہا۔

"تم خود ہی آئینہ دیکھ لو۔ تمہارا حسن اور تمہاری شخصیت کتنی نکھر آئی ہے۔"

وہ سر جھکا کر کہنے لگی۔

"آئینہ تعریف کرے تو اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی کہ محبوب کی زبان سے تعریفیں سن کر اپنی خوشی اور اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔

عاصم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"لیلیٰ — ! تمہیں یاد ہوگا۔ جب ہم پہلی بار مکان تلاش کرنے کے لیے نکلے تھے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم کسی کچے مکان میں رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہو۔ تمہیں ایک اچھے محلے اور اچھے مکان میں رہنا چاہیئے۔ ایک خوبصورت باغیچہ میں ٹہلنا۔ اور اس جیسی قیمتی کاروں میں گھومنا چاہیئے۔

"اب دیکھ لو تم کتنی قیمتی کاروں میں شہزادیوں کی طرح گھوم رہی ہو۔"

وہ سنجیدگی سے کہنے لگی۔

"ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں۔ اور دکھانے کے اور — یہ کار، یہ قیمتی زیورات، وہ کوٹھی اور خوبصورت باغیچہ بظاہر سب کے سب میرے ہیں۔ لیکن حقیقت میں میرے نہیں ہیں۔ — سیٹھ مکرم نے زندگی کی تلخیوں کی طرف سے میری آنکھیں بند کر دی ہیں۔ اور معظم ولا میں ایک شہزادی کا خواب دکھا رہے ہیں —

یہ خواب نو سال کے بعد ٹوٹ جائے گا۔

" ہاں ۔ اس خواب کے ٹوٹنے کے بعد ہی ہماری نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔

عاصم بڑی محبت سے اس کے ہاتھ کو یوں تھپکنے لگا۔ جیسے اسے یقین دلا رہا کہ گھبراؤ نہیں، یہ دور بھی گذر جائے گا۔

وہ ضرورت کی چیزیں خرید کر واپس آئے تو نکاح کا وقت ہو چکا تھا

عاصم دولہا کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اور یلی اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

نکاح کے وقت اکثر یہی ہوتا ہے کہ دلہن بیٹی کے پاس اس کی ماں بیٹھتی ہے۔ اور نکاح قبول کرنے کے لیے کہتی ہے۔

لیکن آج ماں دلہن بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بیٹی ماں کے گھونگھٹ میں سر ڈال کر اس سے سرگوشیوں میں کہہ رہی ہے۔

" امی ۔۔۔ ہاں کہہ دیجیے ۔۔۔ آپ یہ نہ سوچیے کہ ایک ہاں کہنے سے بیٹی کا پرانا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میں آپ کے ہر دکھ سکھ میں آپ سے قریب رہوں گی ۔۔۔ ہاں کہہ دیجیے امی ۔۔۔"

ماں کے سر پر ایک عظیم بیٹی کا سایہ تھا۔ اس نے روتے ہوئے نکاح قبول کر لیا۔

اس کے ہاں کہتے ہی یلی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ نسیمہ نے بھی اسے پوری قوت سے بھینچ لیا تھا۔ دونوں کے چہرے آنسوؤں سے ڈھل رہے تھے

وہ اتنی عورتوں کے سامنے ماں بیٹی کی طرح گلے مل رہی تھیں۔ لیکن ایک دوسرے کو ماں بیٹی کے رشتہ سے مخاطب نہیں کر سکتی

تھیں۔

یلی کی زبان کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ لیکن اس کی آہیں کہہ رہی تھیں۔

" آہ ۔ آپ کی ایک ہاں نے ہمیں دو مختلف گھرانوں میں بانٹ دیا ہے۔ آپ اپنے سسرال کی ہو گئیں۔ اور میں ۔ میرا تو نہ کوئی سسرال ہے۔ اور نہ کوئی میکہ ۔

میں بہت بڑی شہزادی ہوں۔ مگر رہنے کے لیے میرے پاس اپنی ایک جھونپڑی بھی نہیں ہے۔

آپ کے جانے کے بعد میرا کہیں سے کوئی رشتہ نہیں ہوگا۔

ماں کا رشتہ ہوگا ۔۔۔ مگر میں امی نہیں کہہ سکوں گی۔

بہن کا رشتہ ہوگا۔ مگر اس جھوٹے رشتہ کو دل کبھی قبول نہیں کرے گا۔

عاصم سے ایک رشتہ کی آس تھی ۔۔۔ اسے سیٹھ مکرم کی دولت نے کاٹ دیا۔

میرا کہیں سے کوئی رشتہ نہیں ہے امی ۔

میں دنیا کے اتنے بڑے نقشہ پر تنہا کھڑی ہوئی ہوں۔

لیکن آپ فکر نہ کریں ۔ میں آپ کو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دوں گی۔

میں نے کل بھی یہی کہا تھا۔ اور آج بھی یہی کہتی ہوں کہ کوئی مصیبت آئے تو بیٹی کو ضرور آواز دینا ۔۔۔ میں بیٹا بن کر پہنچ جاؤں گی۔

آنسو پونچھ لیجیے امی ۔۔۔ سہاگ کا گھونگھٹ بھیگ رہا ہے۔

دیکھیے تو ذرا ہماری آہ و زاری سے شادی کا گھر کیسا ماتم کدہ بن

گیا ہے۔

یہ تمام عورتیں خاموش کیوں کھڑی ہیں۔ کوئی سہاگ کا گیت کیوں نہیں گاتیں ۔۔۔؟

گانے کو تو میں گا سکتی ہوں۔ میں نے آپ کے سہاگ کے لیے اتنا کچھ کیا ہے تو کیا سہاگ کا ایک گیت نہیں گا سکتی۔

لیکن کونسا گیت ۔۔۔؟

ایک بابل کا گیت ہوتا ہے۔ جسے سن کر باپ کے جذبات کا احساس ہوتا ہے۔

ایک ماتا کا گیت ہوتا ہے ۔۔۔ جسے ماں بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے گاتی ہے۔

لیکن آج تک کسی شاعر نے سہاگ کا وہ گیت نہیں لکھا۔ جسے بیٹے درد بھری آوازیں گائے۔ اور اپنی ماں کو دلہن بنا کر رخصت کرے۔

لوگو! اس دنیا کو آنکھیں بند کر کے نہ دیکھو ۔۔۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ بیٹا باپ کے سر پر سہرا باندھتا ہے۔ بیٹی ماں کے سر پر گھونگھٹ رکھتی ہے۔ کبھی ان بچوں کے لیے بھی سہاگ کا ایک گیت لکھ دیا کرو۔ انہی قربانیاں دینے کے بعد انہیں رونے اور گانے کا حق تو ملنا چاہیئے ۔۔۔؟

ماں کی رخصتی پہ گانے کے لیے بیٹے کے پاس ایک مختصر سا گیت بھی نہیں تھا۔

وہ سسکیوں کے تال پہ آہوں کا مرثیہ سناتے جا رہی تھی۔

موسم گرما کی دوپہر تھی۔

معظم اپنے بستر پہ لیٹا ہوا تھا۔ اور ریلی اس کے قریب بیٹھی ہوئی کہانی سنا رہی تھی۔

کہانی لیلیٰ مجنوں کی نہیں تھی۔

وہ پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں بھی نہیں تھیں۔

معظم جس قسم کی کہانیاں سننے کا عادی تھا۔ اس عادت کو ریلی نے آہستہ آہستہ بدل ڈالا تھا ۔۔۔ بچہ ہو یا بوڑھا۔ اگر ان کے سامنے دلچسپ کہانیاں پیش کی جائیں تو وہ ان دلچسپیوں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

معظم کو بھی اس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کہانی کے دوران بار بار مداخلت کر بیٹھتا تھا۔ اور اکثر بے چین ہو کر پوچھنے لگتا ہے۔

"پھر کیا ہوا ۔۔۔؟"

کہانی پڑھنے والے اور سننے والے کے دل میں یہ تجسس پیدا ہو جائے کہ ۔۔۔ "پھر کیا ہوا ۔۔۔؟" ۔۔۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہانی دلچسپ ہے اور سننے والوں کو متاثر کر رہی ہے۔

کہانی سناتے سناتے یلی کو اچانک خیال آیا کہ اس کی اپنی کہانی بھی ایک ایسے موڑ پر آگئی ہے کہ جہاں ہر وقت اس کا دل پوچھتا ہے۔

"پھر کیا ہو گا — ؟"

کیا یہ نو سال کا طویل عرصہ گذر جائے گا — ؟

یا پھر نو سال کے دوران بھی ایسے ہی آزمائشی موڑ آئیں گے — !

اچانک دوپہر کی خاموشی میں کال بیل کی آواز گونجنے لگی۔

"دوپہر کی اس گرمی میں کون آسکتا ہے ؟"

یلی اُٹھ کر جانے لگی۔

لیکن معظم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر بٹھا لیا۔

"اس لیے میں آپ کا ہاتھ پکڑے رہتا ہوں۔ ذرا سی کوئی بات ہو تو آپ اُٹھ کر چلی جاتی ہیں"

تم ننھے بچے نہیں ہو معظم — "

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔

"میری طرح تمہیں بھی اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ کون آتا ہے۔ اور کون جاتا ہے۔ ملازموں پہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے"

"کیا میں بچہ نہیں ہوں — ؟"

"نہیں — "

یلی اسے سمجھانے لگی۔

"تمہارے جیسے اتنے بڑے لڑکے کو بچہ نہیں کہتے۔"

"ماں باپ لاڈ پیار سے کہہ دیں وہ الگ بات۔ تم خود ہی

سوچو — مجھ سے صرف چار سال کے چھوٹے ہو۔ مگر قد میں دیکھو تو میرے برابر ہو — "

معظم بستر سے اُٹھ کر کہنے لگا۔

"پہلے دن میں آپ کو اپنے برابر سمجھ کر "تم"، کہنے لگا تو آپ نے منع کر دیا۔ کہنے لگے کہ آپ مجھ سے بڑی ہیں۔ پھر آپ یہ کیسے کہتی ہیں کہ میں آپ کے برابر ہوں ؟

یلی ہنستی ہوئی کہنے لگی۔

"تم قد و قامت میں میرے برابر ہو۔ لیکن ذہنی طور پہ ابھی بچے ہو جب تم میری طرح پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤ گے تو میرے برابر ہو جاؤ گے۔

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت داخل ہوئی اسے دیکھتے ہوئے معظم "امی"، کہتا ہوا بستر سے چھلانگ لگا کر ان سے لپٹ گیا۔

خاتون اسے گلے سے لگا کر بے اختیار چومنے لگی۔

آداب — "

یلی نے ان کے قریب آکر کہا۔

خاتون اسے سر سے پیر تک سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں

معظم نے یلی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"امی — ! یہ مس یلی طاہر ہیں۔ یہ میرے ساتھ رہتی ہیں اور مجھے پڑھاتی بھی ہیں"

خاتون مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔

لیلیٰ نے بھی مسکرا کر کہا۔

"آیئے — تشریف رکھیئے۔"

وہ کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

معظم اپنی کتابیں اور کاپیاں لاکر اسے دکھانے لگا۔ خاتون خوشی کا اظہار کرتی ہوئی اس کی تعلیم سے دلچسپی کا اظہار کر رہی تھیں۔ — بار بار شاباش دے رہی تھیں۔ اور کبھی کبھی لیلیٰ کو تعریفی نظروں سے بھی دیکھتی جا رہی تھیں۔

لیلیٰ بڑی سنجیدگی سے کچھ اور سوچے جا رہی تھی۔

خاتون کو دیکھ کر اس کے ذہن سے آپ ہی آپ خدا بخش کا نام ابھر آیا تھا۔

حالانکہ اس خاتون کا دوسرا خاوند کوئی اور ہی خدا بخش ہوگا۔ مگر یہ دشمن نام اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

وہ ماں بیٹے کو لاڈ پیار میں مگن دیکھ کر وہاں سے جانے لگی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں — ؟" معظم نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تمہاری امی اتنی دھوپ میں آئی ہیں۔ کیا انہیں ٹھنڈا شربت نہیں پلاؤ گے — ؟"

پھر وہ جواب سنے بغیر مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔

شربت تیار ہونے کے بعد اس نے ملازم کے ہاتھوں سے بھیج دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں بیٹے کچھ دیر تنہا رہیں تو بہتر ہے۔ خاتون مہینے میں ایک دو بار ملنے آتی تھیں۔ اس لیے ان کا زیادہ وقت

بیٹے کے ساتھ ہی گذرنا چاہیئے تھا۔

دو گھنٹے کے بعد وہ معظم کے کمرے میں گئی تو وہ اپنی ماں سے لپٹ کر سو رہا تھا۔

خاتون نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر آہستگی سے اپنے بیٹے سے الگ ہو کر اٹھنے لگی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے میرے بیٹے پر کوئی جادو کر دیا ہے۔"

"جی — !" لیلیٰ گھبرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"میں جب سے یہاں آئی ہوں۔ وہ تمہاری ہی باتیں کئے جا رہا ہے۔

معظم کیا کہہ رہے تھے۔

وہ پلنگ سے اترتی ہوئے کہنے لگی۔

"وہ اگر کچھ بھی نہ کہتا تو میں اس کی کتابیں دیکھ کر سمجھ لیتی پہلے میں یہاں آتی تھی تو وہ صرف کھیل کود کی باتیں کرتا تھا۔ مگر آج وہ کتابوں کی باتیں کر رہا ہے — یا پھر تمہاری تعریفیں ہی کرتا رہا ہے۔

لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"آیئے — میرے کمرے میں چلے وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

وہ لیلیٰ کے ساتھ کمرے سے باہر چلی آئیں۔ کاریڈور سے گزرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"کوٹھی کی سجاوٹ میں بھی بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں۔"

لیلیٰ نے جواباً کہا۔

وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی ہوں۔ معظم کو بھی اپنے ساتھ لگا لیتی ہوں۔ تاکہ وہ سجاوٹ اور نفاست کو سمجھ سکے۔ اس طرح وہ خود کو ہمیشہ مصروف رکھنے کے عادی ہو جائیں گے۔

بہت اچھی بات ہے۔

وہ لیلیٰ کے کمرے میں داخل ہو کر وہاں کی سجاوٹ کو تعریفی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

پھر انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے جلدی واپس جانا تھا۔ لیکن وہ سو گیا۔ اس سے ملے بغیر جاؤں گی تو وہ ناراض ہو جائے گا۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے؟"

لیلیٰ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر کہنے لگی۔

"یہ تو آپ کے بیٹے کا گھر ہے۔ آپ کو یہاں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہیئے۔"

"ہاں ——!" یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں ان سے پوچھ کر نہیں آئی ہوں۔"

لیلیٰ نے انجان بن کر پوچھا۔

"آپ کس سے اجازت لے کر آئی ہیں؟"

"آں ——!" انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر سنبھل کر کہنے لگیں۔ "تمہیں تو معظم کے ڈیڈی نے بتایا ہو گا۔ کہ میں نے

دوسری شادی کی ہے۔

جی ہاں —— یہ بات مجھے معظم نے بتائی ہے —— اور یہ بھی کہا ہے کہ آپ کے موجودہ خاوند آپ کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔"

خاتون نے ایک گہری سانس چھوڑ کر کہا۔

"ہاں —— یہی بات ہے۔"

لیلیٰ نے انہیں گہری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

بچوں کی پرورش میں ان کے ماضی کی بہت اہمیت ہوتی ہے میں ایک ذمہ دار گورنس کی حیثیت سے معظم کے ماضی کو کرید رہی ہوں۔ کیا آپ معظم کے متعلق کچھ بتا سکتی ہیں؟"

"تم کیا پوچھنا چاہتی ہو ——؟" انہوں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ معظم کو اپنے سوتیلے باپ کا صرف نام معلوم ہے۔ وہ ان کے متعلق مزید کچھ نہیں جانتا —— کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے۔؟

"عجیب سی بات کیا ہو سکتی ہے؟"

ان کے تیور یک بیک بدل گئے۔ انہوں نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

جب میں نے دوسری شادی کی تو معظم تین برس کا تھا۔ وہ میرے ساتھ رہنے کی بجائے اپنے نانا کے پاس رہنے لگا میرے خاوند بھی سوتیلی اولاد کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لیے

انہوں نے بھی معظم سے کبھی ملنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہی وجہ ہے کہ معظم انہیں کبھی دیکھ نہ سکا۔

"پھر بھی محترمہ ۔۔۔!"

لیلیٰ نے کہا۔

"آپ کے خاوند کبھی نہ کبھی تو آپ کے میکے میں ضرور آئے ہوں گے۔ اور معظم نے یقیناً انہیں دیکھا ہوگا ۔۔۔"

وہ تیز نظروں سے اسے گھورنے لگیں۔ پھر انہوں نے بڑے ہی سخت لہجے میں کہا۔

"تم خواہ مخواہ ہمارے ذاتی معاملات میں دلچسپی لے رہی ہو تمہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیئے ۔۔۔"

لیلیٰ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں اپنے فرض سے مجبور ہو کر آپ کے معاملات میں دلچسپی لے رہی ہوں۔"

"میں نہیں جانتی ۔۔۔"

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"میں معظم کی ماں کی حیثیت سے تمہیں حکم دیتی ہوں کہ اس سلسلہ میں کوئی گفتگو نہ کرو۔ ورنہ اس ملازمت سے ہاتھ دھو لو گی۔"

لیلیٰ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

پھر انہوں نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"آپ کی دھمکی سن کر اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ مجھ سے پہلے

گورنس بن کر آنے والی عورتیں آپ ہی کی دھمکیوں کا شکار ہو کر یہاں سے گئی ہیں۔

"یہ جھوٹ ہے ۔۔۔!"

وہ بگڑ کر کہنے لگی۔

"معظم انہیں پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے انہیں مار پیٹ کر نکال دیا ہے۔"

"ہاں ۔۔۔!" لیلیٰ نے کہا۔ "اگر آپ میری بھی شکایت کریں گی تو وہ مجھے بھی نکال دیں گے۔ کیونکہ وہ آپ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں ۔۔۔ ایک ماں کی محبت کے سامنے گورنس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ۔۔۔"

"تم ۔۔۔ تم اپنی حد سے آگے بڑھ رہی ہو ۔۔۔"

انہوں نے غصہ سے کہا

"کیا تم یہی بکواس کرنے کے لیے مجھے اپنے کمرے میں لیکر آئی ہو؟"

لیلیٰ نے یک بیک نرم پڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں ۔۔۔ اگر آپ ناراض ہوتی ہیں تو جانے دیجئے۔ میں اب اس کا ذکر نہیں چھیڑوں گی۔ یہاں گورنس بن کر آنے والی عورتوں کے لیے آپ جیسی بھی ہوں۔ مگر دوسرے ملازموں کے لیے آپ رحمدل خاتون ہیں۔ رمضانی آپ کی بڑی تعریفیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ آپ جب بھی یہاں آتی ہیں ان کے لیے تحفے ضرور لاتی ہیں۔"

خاتون کا غصہ ذرا سرد پڑ گیا تھا۔

انہوں نے جواب دیا۔

"ہاں ۔ وہ میرے بیٹے کی خدمت کرتے ہیں۔ اس لیے میں انہیں کچھ نہ کچھ دیتی رہتی ہوں۔"

لیلیٰ نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

"کچھ نہ کچھ کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی پیسے، کبھی کپڑے، کبھی تیل، اور کبھی صابن ——— لیکن آپ یہ چیزیں نہیں دیتیں۔ جب بھی یہاں آتی ہیں صابن کے بڑے پیکٹ خریدنے کی بجائے آپ دوسری بہت سی چیزیں خرید کر انہیں دے سکتی ہیں۔ لیکن آپ دوسری چیزیں نہیں خریدتیں ——— اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو خریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔

محترمہ ——— ! آپ کسی کو یہ بتانا نہیں چاہتیں کہ آپ کا خاوند کون ہے اور کیا کرتا ہے۔

لیکن میں آپ کو بتاتی ہوں کہ وہ صابن کے ایک بہت بڑے کارخانہ کے مالک ہیں۔

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

لیلیٰ نے بھی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آج رمضان کے ہاتھ میں آپ کا لایا ہوا صابن کا ایک پیکٹ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آپ نے اسی خدا بخش سے دوسری شادی کی ہے۔ جس کا کارخانہ میرپور میں ہے۔

وہ حیرانی سے اور سہمی ہوئی نظروں سے لیلیٰ کو دیکھ رہی تھیں۔

پھر وہ اچانک گھوم کر کمرے سے باہر جانے لگیں۔

"ٹھہریئے ———!"

لیلیٰ نے للکارتے ہوئے کہا۔

اگر آپ نے میری مرضی کے خلاف اس کمرے سے قدم نکالا تو میں آپ کی رام کہانی سننے کے لیے خدا بخش کے پاس پہنچ جاؤں گی۔

وہ دروازہ تک پہنچ کر رک گئیں۔

لیلیٰ کے للکارنے کا انداز بدل گیا۔

اس نے بڑی ہی نرمی سے کہا۔

واپس آ جائیے ——— !

آپ معظم کی والدہ ہیں۔ میں آپ کی دل سے عزت کرتی ہوں

خاتون کے چہرے سے سختی کے آثار غائب ہو چکے تھے۔

وہ تھوڑی دیر تک لیلیٰ کو تنقیدی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ گورنس بن کر یہاں آنے والی یہ لڑکی ان کے خاوند کا پتہ ٹھکانا، سب کچھ جانتی ہو گی۔

وہ شکست خوردہ انداز میں چلتی ہوئی لیلیٰ کے قریب آئی اور جس کرسی سے اٹھ کر گئی تھیں۔ اسی کرسی پر دوبارہ بیٹھ گئی۔

لیلیٰ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ چاہتی ہیں کہ معظم اچھی تعلیم حاصل کرے۔ اور ایک اچھی حیثیت کا مالک بن جائے۔ تو بیٹے کی اچھائی کی خاطر اپنی پہلی شادی سے لے کر دوسری شادی تک کی ساری تفصیل مجھے بتا دیجئے۔"

خاتون نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"تم خواہ مخواہ میرے ماضی کو کرید رہی ہو۔ اس سے تمہیں کوئی

فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"آپ میری فرمائش پوری کر دیجئے۔ — آپ کی داستان سنے کے بعد میں آپ کو بتاؤں گی کہ مجھے کیا فائدہ پہنچنے والا ہے۔"

وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکیں۔ اور یلیٰ کو خالی خالی نظروں سے گھورنے لگیں۔

یلیٰ نے اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

آپ خاموش رہ کر مجھ سے اپنا ماضی نہیں چھپا سکتیں — اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے خاوند سے نہ ملوں۔ تو پھر اپنی زبان کھولئے — دانشمندی یہی ہے۔

خاتون نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے —! میں تمہیں اپنی پہلی شادی سے لے کر دوسری شادی تک کے واقعات سناتی ہوں۔

لیکن وعدہ کرو کہ تم ان واقعات کو کسی دوسرے کے سامنے نہیں دہراؤ گی۔

یلیٰ نے جواباً کہا۔

"اگر میری ملازمت کو اور میرے مستقبل کو کوئی نقصان نہ پہنچا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی اس کمرے سے باہر نہیں جائے گا۔

انہوں نے مطمئن ہو کر کہا۔

"تمہاری ملازمت اور مستقبل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ سچ ہے کہ تم سے پہلے یہاں آنیوالی عورتوں کو معظم نے میرے اشارے پر نکالا ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا — تم میری رازدار بن رہی ہو۔ میں تمہاری مستقل ملازمت کی ضمانت دیتی ہوں۔"

یلیٰ کو مستقل ملازمت کا لالچ دیتے ہوئے انہوں نے بڑی مالکانہ شان سے اسے دیکھا

یلیٰ نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اصل کہانی کی طرف آجائیں۔

وہ ناگواری سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر رہ گئیں۔ پھر بڑی ہی بے بسی سے اپنی داستان کی ابتدا کرتی ہوئی کہنے لگیں۔

میرا نام آسیہ بیگم ہے۔

آج سے تیرہ برس پہلے میری پہلی شادی ہوئی تھی۔

میرے پہلے خاوند، جو آج کروڑ پتی ہیں۔ اور سیٹھ مکرم علی کہلاتے ہیں ان دنوں ایک قلاش آدمی تھے۔ اور ہمیشہ دولت مند بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

شادی سے پہلے میرے والدین نہیں جانتے تھے کہ وہ خبطی قسم کے آدمی ہیں۔ اور دن رات اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح راتوں رات دولت مند بن جائیں۔

میں بھی انہیں ایک ذمہ دار اور تعلیم یافتہ آدمی سمجھتی تھی۔ انہوں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی مل میں الیکٹریکل انجینئر ہیں ہر لڑکی کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ہونے والا خاوند بہت بڑا افسر ہو۔ یا بہت بڑا بزنس مین ہو، اپنی جائیداد ہو۔ اپنی کار ہو، اپنی کوٹھی ہو۔ اور دنیا کا ہر عیش و آرام نصیب ہو۔

یہ سچ ہے کہ تمام خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ لیکن ایک آدھ خواہش کبھی تو ضرور پوری ہونی چاہئے۔ شادی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ جو کوٹھی ہے وہ کرائے کی ہے۔ اور جو کار ہے وہ کمپنی کی ہے۔ ان کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے۔ وہ دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ حاصل کرتے تھے لیکن ہزار پندرہ سو روپے دوستوں کے ساتھ شراب کباب کی محفلوں میں اڑا دیتے تھے۔

میں نے ایک فرمانبردار بیوی کی طرح حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے بارہا ان کے عیبوں کو چھپایا۔ ان کی جھوٹی شان و شوکت پر پردہ ڈالنے کے لیے میں ہر ماہ اپنے میکے سے ہزار پندرہ سو روپے لے کر آتی تھی۔ کوٹھی کا کرایہ دیتی تھی۔ اور قرض خواہوں کا منہ بند کرتی تھی۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں سے اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ میری جانب

پر توجہ دیتے۔

ایک سال کے بعد معظم پیدا ہوا تو مجھے کچھ امید بندھی کہ اب وہ کسی حد تک سنبھل جائیں گے۔ اور ایک خاوند کی نہ سہی، ایک باپ کی ذمہ داری تو ضرور محسوس کریں گے۔ لیکن وہ تباہی و بربادی کے راستے پر بہت دور جا چکے تھے۔ وہاں سے پلٹ کر وہ اپنے معظم کو بھی نہ پا دیکھ سکتے تھے۔ جو ان کا اپنا ہی خون تھا۔

وہ اس قدر بے حس ہو چکے تھے کہ وہ اپنے بچے کے دودھ کے پیسے تو کیا دیتے۔ الٹا مجھ سے ہی شراب کے لیے پیسے طلب کرے جاتے تھے۔

سیٹھ مکرم آج بیٹے کے لیے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ میری کہانی سن کر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ کہ بارہ سال پہلے مکرم صاحب اپنے بیٹے کے دودھ کے پیسے چھین کر لے جایا کرتے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ میں ضرورت کے وقت اپنے میکے سے روپے لے آتی ہوں۔ اس لیے وہ گھر گرہستی کی طرف سے اور زیادہ لاپرواہ ہو گئے تھے۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا کہ قرض خواہوں کو دینے والی رقم وہ میرے بیگ سے نکال کر لے جاتے تھے

پھر ایک دن انہوں نے حد کر دی۔

وہ اپنی عادت کے مطابق پچھلی تمام رات گھر سے غائب رہ کر صبح کے وقت آئے تو بہت ہی گھبرائے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

آسی ۔۔۔ میری عزت خاک میں ملنے والی ہے اگر کہیں سے بل
پچیس ہزار روپے نہ ملے تو میں ملازمت سے برطرف کر دیا جاؤں
گا۔ مل کے مالکان مجھے جیل بھجوا دیں گے۔

میں ان کی باتیں سن کر گھبرا گئی۔

"آخر بات کیا ہو گئی ہے ۔ ؟

میں نے پریشان ہو کر پوچھا

"آپ سے کونسا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ مل کے مالکان آپ کو
جیل بھیج دیں گے۔

مکرم صاحب نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

پچھلی رات میں جوئے میں بری طرح ہار گیا ہوں۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پھر وہی جوا ۔۔۔ پھر وہی
شراب ۔۔۔ پھر وہی تباہی ۔"

تباہی بھی ایسی کہ ملازمت بھی ہاتھ سے جا رہی تھی ۔ اور خاوند
بھی ایک مجرم بن کر جیل کی صورت دیکھنے والا تھا۔

"لیکن ۔۔۔"

میں نے حیرت سے پوچھا۔"

"جوا کھیلنے سے مل کے مالکان آپ کے دشمن کیوں بن گئے ہیں"

"ابھی تو وہ دشمن نہیں ۔"

انہوں نے جواب دیا۔

"لیکن جب انہیں پتہ چلے گا کہ میں جوئے میں کمپنی کی گاڑی
چکا ہوں تو وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔

یں نے پچیس ہزار کی رقم ہاری ہے۔ میرے پاس نقد روپے
ں تھے۔ اس لیے ضمانت کے طور پر گاڑی چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے
ں تھا کہ اتنی رقم کہیں سے بھی قرض مل جائے گی۔ لیکن افسوس!
ا اپنے تمام دوستوں کے سامنے ہاتھ پھیلا چکا ہوں۔ لیکن سب
سب بہانے بنا کر ٹال گئے۔ میرے کمائی پر عیاشی کرنے والوں
یرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

"اب تمہارا ہی آسرا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے برے وقت میں
یرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔"

"خدا نہ کرے کہ میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں ۔۔۔" میں نے
ا۔ "لیکن اتنی بڑی رقم اب ملے گی کہاں سے ۔۔ ؟"

تم اپنے ڈیڈی سے مانگ کر لا سکتی ہو۔"

انہوں نے یہ بات ایسے اطمینان سے کہہ دی جیسے میرے
پ کے پاس روپوں کا درخت ہے۔ میں جاؤں گی اور پچیس ہزار
بے توڑ کر لے آؤں گی

لیکن میں جانتی تھی کہ مجھے اتنی رقم اپنے میکے سے نہیں ملے گی
م صاحب کی آوارگی سے تنگ آ کر ڈیڈی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ
ہے ماہانہ پانچ سو روپے سے ایک پائی بھی زیادہ نہیں دیں
ے۔

یں نے مکرم صاحب کو سمجھانے کی کوششیں کیں کہ ڈیڈی کس
ر ناراض ہیں۔ لیکن انہوں نے میری خوشامدیں کر کے پھر مجھے
لے بھیج دیا۔ تاکہ میں کسی طرح ہاتھ پاؤں جوڑ کر یہ رقم لے آؤں۔

لیکن پاؤں جوڑنے سے بھی کام نہ بنا —— ڈیڈی نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ جیل جانا ہے تو جاتے دو۔ ہوسکتا ہے کہ جیل کی چکیاں پیس کر اسے عقل آجائے۔ بہرحال انہوں نے مجھے ایک پائی بھی نہیں دی۔

مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر اچانک ہی ان کے تیور بدل گئے۔ اور وہ بے تحاشہ مجھے اور میرے والدین کو گالیاں دینے لگے۔

میں ان کی گالیاں برداشت نہ کرسکی۔ میرے منہ میں بھی جو الٹی سیدھی بات آئی ان کے خلاف بکتی چلی گئی۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا۔ اگر میں ان کی گالیاں برداشت کرلیتی تو شاید بات نہ بڑھتی۔ لیکن تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے۔ وہی سامنے آتا ہے۔

وہ دھمکی دے کر چلے گئے کہ اگر شام تک میں نے پچیس ہزار کا بندوبست نہ کیا تو وہ مجھے طلاق دے دیں گے۔

ایک بار پھر میں اپنے میکے دوڑی چلی گئی۔ ڈیڈی وغیرہ طلاق کی دھمکی سن کر گھبرا گئے۔ بیٹی کے سہاگ کو سلامت رکھنے کے لیے پچیس ہزار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ اس وقت نقد روپے ان کے پاس بھی نہیں تھے۔ تمام رقم کاروبار میں پھنسی ہوئی تھی۔

انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ کل صبح تک کسی سے یہ رقم قرض لے لیں گے۔ میں روپوں کی آس میں وہیں رہ گئی۔ خالی ہاتھ جا کر میں اتنی بات نہیں بڑھانا چاہتی تھی کہ طلاق تک نوبت پہنچ جائے۔

دوسرے دن بمشکل دس ہزار روپوں کا انتظام ہوسکا۔ میں یہ

[...]ے کر پہنچی تو وہ موجود نہیں تھے۔ ملازم نے مجھے بتایا کہ وہ تمام رات [...]را انتظار کرتے رہے۔ پھر صبح میرے نام ایک رقعہ چھوڑ [...]ئے ہیں۔

میں نے وہ رقعہ کھول کر پڑھا تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی — وہ طلاق نامہ تھا۔

انہوں نے صاف طور سے یہ لکھا تھا کہ میری بیوی آسیہ بیگم [...]ری ہم مزاج نہیں ہیں۔ بلکہ بدمزاج ہیں۔ دو سال کی ازدواجی زندگی [...] ہمیشہ یہی کوشش کی کہ وہ ایک اچھی اور فرمانبردار بیوی بن جائے [...]ن دن بدن میرے لیے مصیبت بنتی جارہی ہے۔ لہذا میں [...] پورے ہوش و حواس میں رہ کر آسیہ کو طلاق دے رہا [...]وں۔

اس طلاق پر کبھی پچھتانے کے لئے اور اپنی بیوی سے رجوع [کر]نے کے لیے میں یہاں واپس نہیں آؤں گا۔ مجھے تلاش کرنے اور [...]را انتظار کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر آسیہ بیگم نے سر جھکا لیا۔

لیلیٰ انہیں گہری نظروں سے دیکھے جارہی تھی۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں اسی طرح خاموشی طاری رہی [...]ر آسیہ بیگم نے کہا۔

"یہ میری پہلی شادی کے واقعات ہیں"۔

لیلیٰ نے یک بیک ناگواری سے کہا۔

"اب دوسری شادی کے واقعات سنا کر پورا کریں گی۔

"کیا مطلب ــــ ؟" وہ چونک پڑی۔

نیلی نے بدستور ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کہانی آپ نے یہاں بیٹھے بیٹھے بنائی ہے۔ یا مجھ جیسوں کو بے وقوف بنانے کے لیے پہلے سے یہ داستان گھڑ رکھی ہے"

آسیہ بیگم غصہ سے اسے دیکھنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ نیلی سے الجھ پڑیں یا صبر کر کے رہ جائیں۔

انہوں نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں ــ ؟

اس داستان میں کتنا جھوٹ ہے اور کتنا سچ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن جس سچائی کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں انہیں نہیں جھٹلا سکتی۔

محترمہ ــــ! آپ نے اس کہانی میں اپنے والد کو اتنا دولت مند بتایا ہے کہ ہر ماہ آپ کو ہزار پندرہ سو روپے مکرم صاحب کے اخراجات ادا کرنے کے لیے مل جایا کرتے تھے۔

اتنا بڑا جھوٹ کہنے سے پہلے آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ معظم نے آپ کے والد یعنی اپنے نانا کے متعلق مجھے بھی کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا۔

اگر وہ کچھ نہ بھی بتاتا تو میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس کے ہاتھوں میں گلی ڈنڈا دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے معظم غریبوں کی بستی میں رہا کرتے تھے۔

اگر اس کے نانا امیر آدمی ہوتے تو معظم گلی ڈنڈا کھیلنے کی بجائے کرکٹ یا کوئی دوسرا کھیل سیکھتا۔ امیروں اور غریبوں کے بچے کھیلوں

کے انتخاب سے ہی پہچان لئے جاتے ہیں

کیا آپ نے آج تک کسی رئیس زادے کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔ ؟

نہیں محترمہ ــــ! آپ کے والد بزرگوار ایک کچے شکستہ مکان میں رہتے تھے۔ آپ جس طرح مہینہ میں ایک آدھ بار یہاں آتی ہیں اسی طرح وہاں معظم سے ملنے جاتی تھیں اور اس کی پرورش کے لیے اپنے والد کے ہاتھوں پر سو روپیہ رکھ کر چلی آتی تھیں۔"

آسیہ بیگم نے یکایک چیخ کر کہا۔

تم کیا اس کر رہی ہو ــــ ؟ اس کی کوٹھی میں آکر پتہ نہیں خود کو کیا سمجھنے لگی ہو۔"

"میں ایک گورنس بن کر آئی ہوں اور خود کو گورنس ہی سمجھتی ہوں میں نے ابھی جو کچھ بھی کہا ہے۔ وہ معظم کے کردار کو سامنے رکھ کر محض اندازے سے کہا ہے۔ لیکن آپ کے غصہ اور آپ کی تلملاہٹ نے ثابت کر دیا ہے کہ میرا اندازہ بالکل صحیح ہے۔ آپ اتنی دیر سے خواہ مخواہ خود کو مظلوم اور مکرم صاحب کو ظالم ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔"

" وہ غصہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"اگر میں جھوٹی ہوں تو یہی سہی۔ تم مکرم صاحب کا نمک کھاتی ہو۔ اس لیے کبھی یہ تسلیم نہیں کرو گی کہ وہ ظالم ہیں۔"

"جب میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتی۔"

لیلیٰ نے جواب دیا۔

"اور ذہن سے فیصلہ نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک سچ یا جھوٹ کو تسلیم نہیں کرتی ___ ویسے آپ کو غصہ بڑی جلدی آتا ہے۔ آپ کھڑی کیوں ہو گئیں؟ بیٹھیے ___!"

"نہیں ___ اب میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی ___ مجھے واپس جانا ہے!"

"آپ ابھی یہاں سے جانے کا خیال دل میں نہ لائیں ___!"

لیلیٰ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ابھی وہ ضروری باتیں رہ گئی ہیں، جو میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"نہ کریں ___ یہی باتیں میں خدابخش کے سامنے بیٹھ کر کر لوں گی"

آسیہ بیگم دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"تم ___ تم ان سے کیا بات کرنا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ وہ سوتیلے باپ ہو کر معظم سے نفرت کر سکتے ہیں لیکن وہ آپ کو معظم سے نفرت کرنے اور ان سے دور رہنے پہ مجبور نہیں کر سکتے۔ میں انہیں سمجھاؤں گی کہ وہ آپ کو بیٹے سے ملنے کی آزادی دیں۔؟"

آسیہ بیگم نے جھنجھلا کر کہا۔

"وہ مجھے بیٹے سے ملنے کی آزادی دیں یا نہ دیں ___ تمہارا کیا بگڑتا ہے۔؟"

لیلیٰ نے تعجب سے پوچھا۔

"یعنی آپ خود نہیں چاہتیں کہ کوئی آپ کی سفارش کرے اور پ کو بیٹے سے ملنے کی آزادی نصیب ہو۔"

"ہاں ___ یہی سمجھ لو ___!"

لیلیٰ نے ایک طویل سانس چھوڑ کر کہا۔

"چلیے میں آپ کے خاوند سے نہیں ملوں گی۔ سچ پوچھیے تو میں ان کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ مگر ___!"

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

آسیہ بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

"مگر کیا ___؟"

لیلیٰ نے اپنی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے سوتیلے بیٹے سے ملوں گی۔ اور انہیں یہ خوشخبری سناؤں گی کہ آپ ان کی سوتیلی امی ہیں۔"

آسیہ بیگم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

لیلیٰ کہہ رہی تھی۔

"اور عاصم کو یہ خوشخبری بھی سناؤں گی کہ ان کا کارخانہ نقصان ں نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ اس کی آمدنی سے خدابخش نے ایک نئی ٹن کی فیکٹری قائم کی ہے۔ جو آسیہ کیمیکل انڈسٹری کے نام سے ل رہی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے!" آسیہ بیگم نے کہا۔ "میری فیکٹری میرے اپنے

پیسوں سے چل رہی ہے میں کسی عاصم کو نہیں جانتی

لیلیٰ نے طنزیہ پوچھا۔

"اتنی بڑی فیکٹری قائم کرنے کے لیے آپ کے پاس دولت کہاں سے آئی ہے؟ اس کا ثبوت عدالت میں دینا ہوگا۔ آپ کے والدین غریب تھے۔ اس لیے میکے سے اتنی دولت نہیں ملے گی۔ خدا بخش کی بھی کوئی جائداد یا ذاتی رقم نہیں تھی اس نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے۔ وہ سب عاصم کے کارخانہ کی آمدنی میں ہیرا پھیری کرنے کے بعد حاصل کیا ہے۔

انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم عاصم کی اتنی حمایت کیوں کر رہی ہو؟"

لیلیٰ نے سر پہ آنچل رکھتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ وہ میرے ہونے والے شریکِ حیات ہیں۔

"کیا۔؟" وہ حیرت سے لیلیٰ کو تکنے لگیں۔

"محترمہ ۔۔۔! میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر میری ملازمت کو اور میرے مستقبل کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ تو آپ کو بھی مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

لیکن۔ آپ خدا بخش کے ساتھ مل کر عاصم کو نقصان پہنچا رہی ہیں ان کا نقصان میرے مستقبل کا نقصان ہے۔

بہتر یہی ہے کہ آپ میرے ساتھ صلح پسندی سے کام لیں۔ ورنہ میرے ذہن میں آپ کے خلاف ایسے سوالات ہیں کہ اگر میں آپ کے پیچھے پڑ گئی تو ان کے جوابات معلوم کر کے ہی رہوں گی۔

"وہ سوالات کیا ہیں؟" انہوں نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

لیلیٰ نے جواب دیا۔

"سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آپ خدا بخش سے چھپ کر یہاں کیوں آتی ہیں۔

دوسرا سوال یہ کہ میں معظم کے متعلق باتیں کرنے کے سبب خدا بخش سے ملنے کا ارادہ کرتی ہوں تو گھبرا کیوں جاتی ہیں۔

تیسرا اہم سوال یہ ہے کہ معظم سوتیلے باپ کو نام سے جانتے ہیں۔ لیکن صورت نہیں پہچانتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ خدا بخش بھی معظم نام کے کسی سوتیلے بیٹے سے واقف ہے یا نہیں ۔۔۔!

ان تمام سوالوں پر اگر غور کیا جاتے تو یہی شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے معظم کو اپنے دوسرے خاوند سے چھپا کر رکھا ہے۔

شاید اسی لیے آپ یہ نہیں چاہتیں کہ میں خدا بخش کے سامنے معظم کا ذکر چھیڑوں ۔۔۔ دیکھئے آپ پھر گھبرانے لگی ہیں۔

آنچل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پسینہ تو پونچھ لیجئے۔

وہ بے اختیار آنچل اٹھا کر پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگیں۔

لیلیٰ نے کہا۔

"آپ صرف "ہاں" یا "نہ" میں جواب دیجئے ۔۔۔ کیا خدا بخش اپنے سوتیلے بیٹے سے واقف ہے۔

"اگر آپ "ہاں" کہیں گی تو میں آپ کے سچ اور جھوٹ کو جاننے کے لیے خدا بخش سے ضرور ملوں گی۔

اگر آپ نے "نہ" کہا تو میں اس بات کو یہیں ختم کردوں گی۔
آسیہ بیگم نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"نہیں ۔ میں نے ان سے یہ حقیقت چھپا کر رکھی ہے کہ میں معظم کی ماں ہوں۔"

بڑی دیر کے بعد لیلیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"لیلیٰ!"

آسیہ بیگم نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"تم نے وعدہ کیا ہے کہ یہ بات اب یہیں ختم کردو گی۔ اور کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گی۔"

"ہاں ۔۔۔ !" آپ معظم کی والدہ ہیں۔ اس لیے میں وعدہ کا پاس کروں گی۔ لیکن آپ ایک مکار خاتون ہیں۔ جو میرے عاصم کو لوٹ رہی ہیں۔ لہٰذا اب آپ کو یہ بتانا ہوگا کہ عاصم کو کس طرح دھوکہ دیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے خدا بخش کے ساتھ جو نکاح کیا ہے۔ اس نکاح نامہ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی مجھے لاکر دیجیے۔"

"کیوں ۔۔۔ !"

انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"میرے نکاح نامہ سے تمہیں کیا لینا ہے ؟"

لیلیٰ نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"آسیہ کیمیکل انڈسٹری میں عاصم کی رقم لگی ہوئی ہے۔ لیکن یہ ثابت کرنے سے پہلے ہمیں اس بات کا ثبوت دینا ہوگا کہ وہ

کیمیکل انڈسٹری والی آسیہ واقعی خدا بخش کی بیوی ہے۔ اور دونوں میاں بیوی نے مل کر فراڈ کیا ہے۔"

آسیہ بیگم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اگر آپ نے آسیہ کیمیکل انڈسٹری کو عاصم کے نام لکھ دیا اور اس کی ساری رقم لوٹا دی تو بات آگے نہیں بڑھے گی اور کوئی آپ کو مجرم نہیں کہے گا۔"

آسیہ بیگم شش و پنج میں رہ گئی۔ اتنا تو وہ اچھی طرح جان گئی تھیں کہ لڑکی بہت چالاک ہے اور ضدی بھی ہے۔ اگر ضد پر آجائے تو وہ خدا بخش سے ضرور ملے گی۔ جب عاصم سے اتنا قریبی رشتہ ہونے والا ہے تو وہ کسی وقت بھی اس کے باپ سے مل سکتی ہے اور جس راز کو میں برسوں سے چھپا رہی ہوں اسے وہ پل بھر میں فاش کر سکتی ہے۔

لیکن اس راز داری کے لیے ۔۔ یہ لڑکی بہت بڑا مطالبہ کر رہی ہے۔ یعنی میں اپنی صابن کی فیکٹری اور ساری رقم عاصم کو لوٹا دوں۔ وہ کوئی معمولی رقم تو نہیں ہے۔ عاصم کے کارخانہ میں تقریباً بارہ سال سے ہیرا پھیری ہو رہی ہے۔ اس عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے ڈیڑھ لاکھ روپے میری طرف آ گئے ہیں۔ ان روپوں سے ہی ہم نے آسیہ انڈسٹری قائم کی ہے۔

اب اسے عاصم کے نام لکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ میں پھر قلاش ہو جاؤں گی۔ نہیں ! یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ ؟

میں نے مکرم صاحب کو دھوکا دے کر ۔ خدا بخش کو بیوقوف

بنا کر بڑی مشکلوں سے، بڑی محنتوں سے یہ جائداد بنائی ہے۔ پھر
اسے اپنے سوتیلے بیٹے کے نام کیسے لکھ دوں ---؟

لیکن --- لیکن یہ راز داری بھی تو ضروری ہے --- اگر لیلیٰ
نے خدا بخش کو یہ بتایا کہ معظم میرے پہلے خاوند کا بیٹا ہے۔ تو میری
برسوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔

وہ شش و پنج میں الجھتی چلی گئیں۔

آخر انہوں نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

لیلیٰ --- ! میرے راز کو راز رکھنے کے بیسے تم نے اتنا بڑا مطالبہ
کیا ہے کہ جسے میں پورا کر دوں تو بالکل قلاش ہو جاؤں گی۔

یہ سچ ہے کہ میں نے فراڈ کیا ہے۔ لیکن فراڈ کے بعد جو اتنی دولت
میرے پاس آئی ہے اسے کس دل سے عاصم کے نام لکھ دوں؟

لیلیٰ نے جواب دیا۔

آپ عاصم کے ساتھ ایک ماں بن کر دیانتداری سے پیش آئیے۔
میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ عاصم آپ کو کسی کا محتاج بن کر نہیں
رہنے دیں گے۔ وہ ہر ماہ آپ کو معقول رقم دیا کریں گے۔ کہ آپ کا
بڑھاپا آرام سے گذر جائے گا۔

محترمہ ! زیادہ لالچ اچھا نہیں ہوتا --- اگر لالچ کرنا ہی ہے
تو پھر آپ کی مرضی --- اس کے بعد میری جو مرضی ہو گی وہ میں آپ
کے خلاف کر گزروں گی۔

" نہیں، نہیں --- !

وہ جلدی سے کہنے لگیں۔

یں نہیں چاہتی کہ ہم آپس میں دشمنی رکھیں۔ لیکن لیلیٰ --- !
ے مجھے ایک زبردست دورا ہے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ مجھے فیصلہ
ے کے لیے تھوڑا سا وقت چاہیے۔ اگلے مہینے میں جب یہاں
گی تو تمہیں کوئی آخری فیصلہ سناؤں گی۔"

"اگلے مہینے ---؟"

لیلیٰ نے سخت لہجے میں کہا۔

"عاصم کے دن رات کا سکون برباد ہو چکا ہے ان کے بڑھے
ے پٹلو، الجھے ہوئے بال بیمار چہرہ اور ذہنی پریشانی کو دیکھ کر
ے دل پر کیا گذرتی ہے۔ یہ آپ جیسی بے حس عورتیں نہیں جان
یں۔

"آپ اگلے مہینے کی بات کر رہی ہیں اور میں اگلے دن کا انتظار
یں کر سکتی۔ آپ سینکڑوں میل کے فاصلے پر نہیں رہتی ہیں۔ اسی
ہیں رہتی ہیں۔ لہٰذا آپ ابھی کر وہ نکاح نامہ اور ضروری کاغذ
سکتی ہیں۔ جن کی روشنی میں خدا بخش کا فراڈ کھل کر سامنے
جائے گا۔"

آسیہ بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔

"لیکن میں یہاں سے جانے کے بعد اپنے خاوند سے کس طرح بہانہ
کر دوبارہ آ سکتی ہوں؟"

"لیلیٰ نے طنز بہ انداز میں کہا۔

"بہانے بنانا اور خاوند کو دھوکہ دینا آپ جیسی عورتوں کے
یے تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

"اتنی دیر مجھے باتیں کرتے کے بعد آپ نے یہ اندازہ لگالیا ہوگا کہ اپنی بات منوا کر رہتی ہوں۔ لہذا آپ فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔"

یہ کہتی ہوئی لیلیٰ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلیئے معظم کے اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں ان سے کہہ دوں گی آپ تھوڑی دیر کے لیے جا رہی ہیں۔ اندھیرا ہونے تک پھر واپس آجائیں گی۔"

آسیہ بیگم بھی آہستگی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

ان کے چہرے سے کشمکش اور پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے لیکن اب یہ پریشانی اس لیے نہیں تھی ایک معمولی سی لڑکی ان کے ہاتھوں سے ڈیڑھ لاکھ روپے کی جائیداد چھین کر عاصم کو دے دے گی۔

نہ جانے کتنی فریب کاریوں کے بعد انہوں نے یہ جائیداد بنائی تھی — مانگو تو کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا — اس لیے آسیہ نے مانگنے کی بجائے چھیننے کا فن سیکھ لیا تھا۔ چھیننے اور جھپٹنے کے دوران کئی رکاوٹیں آتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو توڑنا ہی سب سے بڑا کمال ہوتا ہے۔

آسیہ بیگم کو یہ کمال حاصل تھا۔

اس سے پہلے کہ لیلیٰ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے وہ خود لیلیٰ کو کمزور بنا سکتی تھیں۔

"ٹھیک تو ہے۔!"

وہ سوچنے لگیں۔

یہ لڑکی اس کی کوٹھی میں تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ اس سے کہ وہ میرے راز کو فاش کرے۔ میں اسے یہاں ہمیشہ کی نیند سکتی ہوں۔

یک بیک انہوں نے لیلیٰ سے کہا۔

"تم معظم سے یہ نہ کہو کہ میں ابھی یہاں دوبارہ واپس آؤں ورنہ میرے انتظار میں رات کو دیر تک جاگتا رہے گا۔ میں ی موجودگی میں کھل کر باتیں نہیں کر سکوں گی۔"

"ہم — !"

لیلیٰ نے کاریڈور سے گذرتے ہوئے کہا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ معظم کے سونے کے بعد یا آئیں گی۔

آسیہ بیگم نے جواب دیا۔

"تقریباً گیارہ بجے رات کو — کیونکہ دس بجے تک میرے ند شراب کے نشہ میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہاں آسکتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔!"

"میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

لیلیٰ یہ کہتی ہوئی معظم کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ آسیہ بیگم کے پیچھے تھیں۔ اس لیے وہ اس کی مکارانہ مسکراہٹ کو نہ دیکھ جو ایک مکار عورت کے ہونٹوں پر خنجر کی طرح تیز ہوتی جا تی۔

رات کی تاریکی پھیل چکی تھی

آسیہ بیگم نے اپنی کوٹھی کے پورٹیکو میں کار سے اتر کر دیکھا — ان کا چہیتا بھائی افضل لان میں بیٹھا ہوا چرس کا دم لگا رہا تھا بہن کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر قریب آیا۔ اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"دولہا بھائی نمبر دو — بہت دیر سے آپ کی انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کو بیگم سعیدا اپنے ساتھ کہیں لے گئی ہیں —"

"ٹھیک ہے —"

انہوں نے مطمئن ہو کر کہا۔

"اب کیا پوزیشن ہے —؟"

افضل نے دانت نکال کر جواب دیا۔

شائستہ ان کا دل بہلا رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک شائستہ اور شراب دونوں ہی ان پر اثر کر چکی ہوں گی۔"

"ہم —!"

انہوں نے لان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"تم جا کر دیکھو۔ وہ ہوش میں ہیں یا بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اگر وہ سو گئے ہوں تو شائستہ کو اس کی فیس دے کر رخصت کر دو۔"

"جی — بہت اچھا —!"

افضل حکم کی تعمیل کے لیے کوٹھی کے اندر چلا گیا۔

آسیہ بیگم لان میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں اور لیلیٰ کے متعلق سوچنے لگیں۔

زندگی میں پہلی بار ان سے ایک ایسی لڑکی ٹکرائی تھی جس سے انہیں زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ خطرات سے وہ کھیلتی ہی رہتی تھیں۔ لیکن لیلیٰ دو دھاری تلوار کا خطرہ بن گئی تھی — دو دھاری تلوار یعنی ایک طرف کی دھار سے بچو تو دوسری طرف کی دھار کاٹنے کو آجاتی ہے۔

لیلیٰ کے ذریعہ اگر خدا بخش کو یہ پتہ بھی چل جاتا کہ وہ معظم کے پہلے باپ ہیں تو بات اتنی نہ بگڑتی — خدا بخش ابھی آسیہ بیگم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ کیونکہ آسیہ کیمیکل انڈسٹری کو وہ اپنے نام کرا چکی تھیں۔

خطرہ کچھ اور ہی تھا۔ جسے لیلیٰ ابھی اب تک نہیں سمجھ سکی تھی۔ سمجھنے والی تھی — جس وقت بھی نکاح نامہ لیلیٰ کی نظروں سے گزرتا وہ آسیہ بیگم کے ایک بہت بڑے راز کو جان لیتی — وہ بہت بڑا راز ایسا ہی تھا کہ جس کے فاش ہوتے ہی آسیہ بیگم کی دولت اور جائیداد حتیٰ کہ ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

وہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلنے لگیں۔ لیلیٰ جتنی دیر تک زندہ

رہتی۔ اتنی دیر تک وہ چین سے نہیں رہ سکتی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے گیارہ بجے کے بعد اس لڑکی کی موت کا وقت مقرر کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی جب تک گھڑی کا کانٹا گیارہ پر نہ آتا۔ اس وقت تک ان کی بے چینی نہ جاتی۔

تھوڑی دیر کے بعد افضل ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ کوٹھی سے نکل کر لان میں آیا۔

لڑکی نے آسیہ بیگم کو دیکھتے ہی جھک کر کہا۔

"ہیلو مادام آسی ۔۔۔! آپ باہر کیوں بیٹھی ہیں؟"

"میں یونہی ۔۔۔!" انہوں نے کہا۔ "تمہیں فیس مل گئی؟"

"جی ہاں ۔۔۔ شکریہ!" شائستہ نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا نواب تم جاؤ!" انہوں نے کہا۔ "مجھے افضل سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

شائستہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

آسیہ بیگم لان کی نیم تاریکی میں اسے جاتی ہوئی دیکھتی رہیں۔

جب وہ کوٹھی کے مین گیٹ سے باہر نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔۔۔ تو انہوں نے افضل کو مخاطب کرتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"افضل ۔۔۔! میں نے تمہیں بارہا سمجھایا ہے کہ میں کوٹھی سے باہر رہوں تو تم نشہ نہ کیا کرو۔ اب اگر کوئی خطرہ سامنے آ گیا تو تم نشہ کی حالت میں کیا کر سکو گے۔ ۔۔۔؟"

افضل نے کرسی قریب کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہو باجی ۔۔۔! آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں۔ میں نے

اتنا زیادہ نشہ کیا ہے؟ دیکھ لیجئے! میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔"

"ہم ۔۔۔!"

آسیہ بیگم نے کہا۔

"دو گھنٹے کے بعد تمہیں میرے ساتھ معظم ولا چلنا ہو گا۔"

"کوئی خاص بات ۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔! ایک دشمن کو راستے سے ہٹانا ہے۔"

افضل کے دانت نکل گئے اور آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہو گئی۔ جیسے بھوکے درندے کے سامنے کوئی شکار آ گیا ہو۔

اس نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔

"یعنی ۔۔۔ کسی کو قتل کرنا ہے۔"

"ہاں ۔۔۔!"

"کون ہے وہ ۔۔۔؟"

"ایک لڑکی ۔۔۔!"

افضل کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"لاحول ولا قوۃ ۔۔۔! میں سمجھا تھا کسی مرد سے ٹکرانا ہو گا۔"

"بکواس مت کرو ۔۔۔!" آسیہ بیگم نے بگڑ کر کہا۔

"تمہاری شیخی کی عادت نہیں جاتی۔ کام کے وقت بھی بکواس کرتے ہو۔"

"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہیں کام سے انکار تو نہیں کیا ہوں۔ بتائیے کون ہے وہ لڑکی؟"

"معظم کی نئی گورنس ہے۔ وہ کم بخت خدا بخش کو پہلے سے جانتی ہے۔ میں نے ملازموں کو صابن کا پیکٹ لے جا کر دیا تو اس نے تاڑ لیا کہ معظم کا سوتیلا باپ وہی صابن والا خدا بخش ہے۔۔۔"

وہ لیلیٰ کے متعلق تمام تفصیلات بیان کرنے لگیں اور اپنے بھائی کو اس خطرے سے آگاہ کرنے لگیں۔ جو انہیں پیش آنے والا تھا۔

وہ بڑے غور سے بہن کی باتیں سن رہا تھا۔

پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"لڑکی بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔ کیا۔ ایسی چالاک لڑکی کو اس بات کا شبہ نہیں ہوگا کہ آپ اس کی جان کی دشمن بھی بن سکتی ہیں یا نہیں۔۔۔؟"

آسیہ بیگم نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"میں اتنی نادان نہیں ہوں کہ اسے شبہ میں مبتلا کر دیتی۔ میں اس کے سامنے ایک ڈرپوک عورت کی طرح سہمی سہمی سی رہتی ہوں۔ اور اس کی ہر بات کو اس طرح تسلیم کرتی گئی ہوں کہ وہ کبھی مجھ پر شبہ نہیں کرے گی۔

اس وقت بھی میں اپنا نکاح نامہ اور چند ضروری کاغذات لے کر جاؤں گی۔ تاکہ اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔

لیکن باجی۔۔۔! اس طرح تو وہ نکاح نامہ کو پڑھ لے گی۔

"پڑھ لینے دو۔۔۔ اس کے بعد وہ نکاح نامہ کسی کو دکھانے کے لیے زندہ کب رہے گی۔

اسے قتل کرنے کا جو منصوبہ میں نے بنایا ہے۔ پہلے تم اسے غور سے سن لو۔ پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ نکاح نامہ وہاں سے جانا کتنا ضروری ہے۔

گیارہ بجے کا وقت میں نے اس لیے مقرر کیا ہے کہ نو بجے معظم سو جاتا ہے۔ اس کے ایک گھنٹہ بعد ملازم اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے ہیں۔ اس لیے لیلیٰ تنہا اس کوٹھی میں رہے گی۔

لیکن اس کے باوجود تم وہاں پہنچتے ہی اس پر قاتلانہ حملہ نہیں کر سکتے ہیں احتیاطاً یہ دیکھنا ہوگا کہ معظم واقعی سو رہا ہے یا نہیں۔

میں کوٹھی میں جا کر سب سے پہلے اس بات کا پتہ کروں گی۔

اور لیلیٰ سب سے پہلے مجھ سے نکاح نامہ طلب کرے گی۔ کیونکہ وہ بار بار یہ تاکید کر چکی ہے کہ عاصم کی کامیابی کے لیے نکاح نامہ بہت ضروری ہے۔

"بہر حال کوٹھی کے اندرونی حالات کا جائزہ لینے کے لیے پندرہ بیس منٹ ضرور لگیں گے۔ اس عرصہ میں اگر میں نے اسے نکاح نامہ نہ دیا یا کوئی جعلی کاغذ اسے پکڑا دیا تو اسے شبہ ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں تمہارا کام بگڑ سکتا ہے۔ وہ چالاک لڑکی پھر تمہارے قابو میں نہیں آئے گی۔

"واقعی۔۔۔!" افضل نے کہا۔ "نکاح نامہ لے جانا بہت ضروری ہے۔ اچھا یہ بتایئے کہ میں اس وقت تک کہاں رہوں؟"

"میں تو لیلیٰ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں رہوں گی۔ تم ڈرائنگ روم

کے سامنے والے کاریڈور میں پہنچ جانا ——— دروازے کے
قریب ہی مین سوئچ کو آف کر دینا —— تمام کوٹھی میں اندھیرا چھا جانے
کی دو ہی وجوہات بیلی کی سمجھ میں آئیں گی۔ پہلی وجہ تو یہ کہ الیکٹرک
سپلائی کی طرف سے تھوڑی دیر کے لیے لائن بند ہو گئی ہے دوسری
وجہ یہ کہ مین سوئچ میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔

بہر حال جلد یا بدیر اسے مین سوئچ کی طرف جانا ہو گا۔ وہ
خود ہی تمہاری طرف کھنچی آئے گی۔ پھر یہ تمہارا کام ہے کہ وہ وہاں
سے واپس نہ جا سکے۔ کام اتنی ہوشیاری اور پھرتی سے ہونا چاہیے
کہ اس کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکے۔ اگر اس نے چیخنا شروع کر دیا
تو پھر ہمارا وہاں سے بچ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔

"آپ اطمینان رکھیئے باجی ——!"

افضل نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"میں کوئی کچا کھلاڑی نہیں ہوں۔ بھیڑ کی طرح اس کی گردن
اتار کر رکھ دوں گا۔"

آسیہ بیگم کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

پھر اس سے کہنے لگیں۔

"ابھی ہمارے سوچنے سمجھنے کے لیے کافی وقت ہے تم بھی
غور کرو تاکہ اس منصوبہ میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔

تم یہ نہ سوچو کہ تمہارے مقابل ایک کمزور لڑکی ہے۔

لومڑی، شیر کے مقابلہ میں بہت کمزور ہوتی ہے۔ لیکن اپنی چالاکی
سے شیر کو بھی دھوکہ دے جاتی ہے۔

اس بات کو اچھی طرح یاد رکھو کہ تم ایک چالاک لومڑی کا شکار
کرنے جا رہے ہو۔"

یہ کہتی ہوئی وہ لان سے کوٹھی کی طرف جانے لگی۔

افضل اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ کوٹھی کے اندر
نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ تو اس نے بڑی حقارت سے کہا۔

"اونہہ —— لومڑی ——"

چرس کا ایک سگریٹ نکال کر اسنے ہونٹوں سے لگایا۔ اور
دیا سلائی سے سلگانے لگا۔

لان کی تاریکی میں جلتی ہوئی تیلی کا عکس اس کے چہرے پر پڑ رہا تھا
۔ گھنی مونچھوں کے سائے موٹے موٹے ہونٹ، بھاری ناک اور
چھوٹی سفاک آنکھیں بڑی ہی ہیبت ناک لگ رہی تھیں ——— موت
اگر کوئی چہرہ ہوتا تو افضل چرسی سے ضرور مشابہت رکھتا۔

پھر اس نے ایک ہی پھونک میں جلتی ہوئی تیلی کو یوں بجھا دیا۔
جیسے ایک ہی جھٹکے میں کسی کی زندگی کا چراغ گل کر کے مطمئن ہو گیا ہو۔

بیلا ہاتھوں میں ٹرے لیے اپنے کمرے سے نکلی اور کاریڈور

کی نیم تاریکی سے گذر کر کچن کی طرف جانے لگی۔

ٹرے پہ چائے کی تین خالی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ چینی کی ان پیالیوں میں پڑے ہوئے چمچے پیلی کے ہر قدم پر لرز رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کی آواز ایسی لگ رہی تھی۔ جیسے خوف و دہشت سے کسی کے دانت بج رہے ہوں۔

وہ راتوں کو کوٹھی کی تمام لائٹیں بجھا دیا کرتی تھی۔ سوتے وقت اس کے اور معظم کے کمروں میں صرف زیرو پاور کا بلو بلب روشن ہوتا تھا۔ لیکن آج آسیہ بیگم کے انتظار میں اس نے ڈرائنگ روم کی بتیاں روشن کر رکھی تھیں۔ یہ روشنی کسی نہ کسی طرح کاریڈور تک پہنچ رہی تھی اور کاریڈور کی تاریکی سے الجھ کر پیلی کو آگے بڑھنے کا راستہ دے رہی تھی۔

اسی وقت رات کے سناٹے میں کال بیل کی آواز اسے پکارنے لگی۔

اس کے قدم رک گئے۔

چمچے اور پیالوں کے دانت بجنے بند ہو گئے۔

"شاید آسیہ بیگم آ گئی ہیں ——!"

وہ پلٹ کر ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی —— تنہا —— اکیلی

—— وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے بڑھتے ہوئے ہر قدم کے ساتھ ایک انجانا خطرہ قریب تر آ رہا ہے۔

کال بیل ٹرر ٹرر کی بے ہنگم آواز میں پکار رہی تھی۔ چمچے اور پیالیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

ڈرائنگ روم میں پہنچ کر کال بیل کی آواز بند ہو گئی۔

اس نے ٹرے کو ایک تپائی پر رکھ کر اپنے کمرے کی سمت دیکھا حالانکہ کمرہ وہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ بے خیالی میں کمرے کی سمت یوں دیکھنے لگی تھی۔ جیسے خطرے کے وقت کوئی بے اختیار اپنی پناہ گاہ کی طرف دیکھتا ہے۔

ڈرائنگ روم میں لمحہ بھر کے لیے گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

پھر اس گہری خاموشی میں وال کلاک کی ٹن ٹن بکھرنے لگیں —— ٹھیک گیارہ بجے تھے۔

وہ سمندر کی جھاگ والے قالین پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی اور اسے کھول کر سامنے والے کاریڈور میں جھانکنے لگی۔

کاریڈور کی دوسری جانب جو دروازہ تھا۔ اس دروازے کے شیشے پر ایک عورت کا مبہم سا سایہ نظر آ رہا تھا۔

وہ مطمئن ہو کر کاریڈور کو عبور کرتی ہوئی آئی اور دروازے کی چٹخنی گرا دی۔

دروازہ کھلتے ہی آسیہ بیگم کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ انہوں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو —— میں ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔"

پیلی مسکراتی ہوئی دروازے کی چٹخنی لگانے لگی۔

آسیہ بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"رہنے دو —— ابھی چٹخنی نہ لگاؤ۔ میں بڑی مشکلوں سے آئی

ہوں۔ فوراً ہی واپس چلی جاؤں گی۔

وہ لیلیٰ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی

"آپ کاغذات لے آئی ہیں ـــ ؟"

"ہاں ـــ !"

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئیں۔ اور اپنا بیگ کھولتے ہوئے چاروں طرف تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

لیلیٰ نے بیگ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور وہ نکاح نامہ ـــ ؟"

"وہ بھی لے آئی ہوں ـــ"

انہوں نے بیگ سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ کاغذ کی تہہ کو کھول کر پڑھنے لگی۔

آسیہ بیگم چاروں طرف گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں ڈرائنگ روم کے یہاں سے وہاں تک چھائی ہوئی پُراسرار خاموشی انہیں بتا رہی تھی کہ لیلیٰ اس وقت بالکل تنہا ہے۔

انہوں نے مطمئن ہو کر پوچھا۔

"کیا معظم سو رہا ہے ـ ؟"

"جی ہاں ـــ !"

لیلیٰ نے نکاح نامہ سے سر اٹھا کر کہا۔

"وہ تو دس بجے ہی سو گئے تھے۔"

آسیہ بیگم وال کلاک کی طرف دیکھنے لگیں ـــ دس منٹ گذر

چکے تھے۔

اب صرف دس منٹ اور رہ گئے تھے۔ ان کے سامنے وہ خوبصورت سی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی صرف دس منٹ رہ گئی تھی۔

انہوں نے بیگ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا ـــ ؟"

"ڈر ـــ ؟"

لیلیٰ نے پھر نکاح نامہ سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

وہ سر جھکا کر بیگ سے کاغذات نکال رہی تھیں۔ پھر انہوں نے کاغذات اس کی جانب بڑھاتے ہوئے نظریں اٹھائیں تو لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔

"اب تک اس کوٹھی میں کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوا یوں بھی میں تمام دروازوں کو لاک کر کے سوتی ہوں۔ آج محض آپ کی وجہ سے ایک دروازہ کھلا رہ گیا ہے۔"

وہ آسیہ بیگم کے ہاتھوں سے کاغذات لے کر دیکھنے لگی۔

"ان دستاویزات سے تمہیں معلوم ہو گا کہ میں آسیہ کیمیکل انڈسٹری کی واحد مالک و مختار ہوں۔ آخر میں دیکھو تو تمہیں خدا بخش کے دستخط نظر آئیں گے۔"

آسیہ بیگم نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"تم کھڑی کیوں ہو۔ یہ تو اطمینان سے بیٹھ کر پڑھنے کی چیزیں ہیں ـــ"

"آں ـــ ہاں !" لیلیٰ نے نظریں اٹھا کر کہا۔ "ان کاغذات کو مجھ سے زیادہ عاصم سمجھ سکتے ہیں۔ میں تو یونہی سرسری طور سے دیکھ رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں پہلے عاصم کے پاس جا کر انہیں دکھا لاؤں ـــ آپ جب تک یہاں بیٹھیے میں ابھی آ جاؤں گی ـ ؟"

آسیہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"تم اتنی رات کو عاصم کے پاس جاؤ گی ـ ؟"

ان کی بات پوری ہوتے ہی اچانک ڈرائنگ روم میں تاریکی چھا گئی ـــ صرف ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ پوری کوٹھی میں اندھیرا مسلط ہو گیا تھا۔

"یہ لائٹس کس طرح آف ہو گئیں ـ ؟"

تاریکی میں لیلیٰ کی گھبرائی ہوئی سی آواز ابھری۔

"شاید ـ ـ ـ ـ !"

آسیہ بیگم کی آواز سنائی دی۔

شاید ـــ مین سوئچ میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔

"آں ـ مگر ـــ !"

لیلیٰ کی آواز میں اب گھبراہٹ کم حیرت کا اظہار زیادہ تھا۔ مگر مین سوئچ میں بھلا کیا خرابی ہو سکتی ہے ـ ؟

"آسیہ بیگم نے اپنی بات کا وزن بڑھانے کے لیے کہا۔

"میرے ہاں تو اکثر ایسا ہوتا ہے، ملازم راتوں کو اٹھ کر مین سوئچ کو ٹٹولتے ہیں۔ ٹھیک کرتے ہیں، تب کہیں جا کر روشنی ہوتی ہے ـ"

پھر تو یہی بات ہو گی۔

لیلیٰ نے ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

"آپ ذرا ایک منٹ انتظار کیجئے میں ٹارچ لے کر آتی ہوں"

"اچھا ـــ !"

آسیہ بیگم کی گھبرائی ہوئی صورت تاریکی میں نظر نہیں آ رہی تھی وہ صوفہ کے قریب کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے اگلے پل کیا ہونے والا ہے ـ ؟

انہوں نے افضل کو سمجھا دیا تھا کہ لیلیٰ کو چیخنے کی مہلت بھی نہ دے۔ لیکن بھول چوک بھی ہو سکتی تھی۔ لیلیٰ کے حلق سے آواز نکلنے پر انہیں یہاں سے فرار ہونے کے لیے بالکل مستعد رہنا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک پنسل ٹارچ کی روشنی نظر آئی روشنی کا دائرہ اتنا محدود تھا کہ ٹارچ پکڑ کر چلنے والی لیلیٰ بھی نظر نہیں آ رہی تھی ـــ وہ روشنی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی ڈرائنگ روم کے باہر دروازے تک آئی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

آسیہ بیگم کا دل اور بھی شدت سے دھڑکنے لگا ـــ خوف کی وجہ سے وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔ اب ڈرائنگ روم میں تنہا کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ دانشمندی یہی تھی کہ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر کاریڈور کے باہری دروازے تک پہنچ جائیں۔ تاکہ جلد از جلد فرار ہونے میں آسانی رہے ـ

وہ دبے قدموں چلتی ہوئی دروازے تک آئیں اور اندھیرے میں دروازے کے ہینڈل کو ٹٹولنے کے لیے اپنے ایک ہاتھ کو آگے

بڑھایا۔ لیکن پھر ایک جھٹکے سے یوں اپنے ہاتھ کو کھینچ لیا جیسے بجلی کا شاک پہنچ گیا ہو۔

اندھیرے میں دروازے کے قریب بیلی کھڑی ہوئی تھی۔

پھر وہ ٹارچ کی روشنی باہر کس طرح گئی تھی۔۔؟

اسی وقت کاریڈور کی طرف سے چیزوں کے گرنے پڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر ہانپنے اور کراہنے کی آوازوں سے یوں ظاہر ہونے لگا جیسے دو افراد آپس میں گتھ گئے ہوں۔

اچانک اندھیرے میں بیلی کی گھبرائی ہوئی سی چیخ سنائی دی۔

"کون ہے۔۔؟

"یہ کیا ہو رہا ہے۔۔؟

"عاصم آپ کہاں ہیں۔۔؟

جواب میں کاریڈور سے عاصم کی آواز سنائی دی۔

"گھبراؤ نہیں۔۔ تم ادھر نہ آنا۔۔"

اس کی بات پوری نہ ہو سکی تھی۔ شاید کسی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔

آسیہ بیگم اندھیرے میں لیٹی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھیں انکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عاصم یہاں موجود ہوگا۔ حالانکہ بیلی نے ابھی ان سے کہا تھا کہ وہ کاغذات عاصم سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا ابھی وہ عاصم کے پاس انہیں دکھا کر لائے گی۔

لیکن آسیہ بیگم کو دھوکہ ہو گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ عاصم یہاں

ہیں ہے۔ بیلی اتنی رات کو اس کے پاس کاغذات لے کر جائے گی ۔۔ آہ! قتل کے منصوبہ میں یہ ایک معمولی سا نکتہ تھا کہ بیلی ان کاغذات کو نہیں سمجھ سکے گی۔ لہذا وہ عاصم کو ضرور بلائے گی۔

اب ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جاتے ۔۔؟ جی تو چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر بیلی کی گردن دبوچ لیں۔۔ لیکن اس وقت کے ان کے ہاتھ پاؤں میں اتنا دم نہیں رہا تھا کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ سکیں۔۔ بس ایک ذرا سی آس تھی کہ قاتل، عاصم پر قابو پا لے گا۔ اور پھر بیلی سے بھی نمٹ لے گا۔ اسی ایک مبہم سی امید پر وہ خود کو تسلی دیئے جا رہی تھیں۔

جب اپنی حماقتیں یاد آتی ہیں تو پھر یاد آتی ہی چلی جاتی ہیں اب آسیہ بیگم کو وہ ٹرے یاد آ رہی تھی۔ جس پر چائے کی تین خالی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس وقت ان خالی پیالیوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ تین پیالیوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس کوٹھی میں تین افراد جاگ رہے ہیں۔

ایک بیلی ۔۔ دوسرا عاصم ۔۔ اور ۔۔ اور تیسری لی کس لیے تھی؟

تیسری پیالی معظم کے لیے نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ وہ بجے ہی سو گیا تھا۔

اسی وقت کوئی اندھیرے میں تیزی سے چلتا ہوا ان قریب سے گذرا ۔۔ اس کے بعد ڈرائنگ روم

کا دروازہ کھلا ——— اور پھر ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

"خبردار ——— ! میرے ہاتھ میں ریوالور ہے ——— تم دونوں میں سے کوئی حرکت نہ کرے۔"

وہ گرجدار آواز ——— اس آواز کو آسیہ بیگم لاکھوں میں پہچان سکتی تھی ——— وہ سیٹھ مکرم کی آواز تھی۔

اچانک آسیہ بیگم کا سر چکرایا۔ سمندر کے جھاگ والے قالین پر وہ تاریکی میں کہیں ڈوبنے لگیں ——— پھر وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

آسیہ بیگم کو ہوش آنے لگا۔

کوئی ان کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا ——— ڈرائنگ روم میں روشنی ہو چکی تھی۔ اور عاصم پانی کا جگ لیے ان کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔

پھر ان کے کانوں میں افضل کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ کسی اذیت میں مبتلا ہو کر مسلسل کراہ رہا تھا۔ انہوں نے سر جھکا کر دیکھا ——— دور ایک صوفہ پر سیٹھ مکرم بیٹھے ہوئے تھے۔

انہوں نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔

"نان سنس ——— ! انہیں ہوش آگیا۔"

آسیہ بیگم آہستہ آہستہ قالین پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

لیلیٰ ان سے ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی ——— اور ٹھیک ان کے پیچھے افضل قالین پر اوندھے منہ پڑا ہوا کراہ رہا تھا اس کی قمیض تار تار ہو چکی تھی۔ اور وہ قمیض کے ایک چیتھڑے کو اپنی ایک آنکھ پر رکھے ہوئے تکلیف کی شدت سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

آسیہ بیگم سہمی ہوئی نظروں سے کبھی اپنے بھائی اور کبھی سیٹھ مکرم کو دیکھ رہی تھیں۔

"آسی ——— !"

"میں نے تمہیں سمجھا دیا تھا کہ معظم سے ملنے کے لیے صرف تم یہاں آسکتی ہو۔ تمہارا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں آئے گا۔ پھر تمہارا یہ بھائی کس لیے آیا ہے اور جب آ ہی گیا ہے تو اس نے یہ سوچ کر کس مقصد کے لئے آدن کیا تھا۔ ؟"

آسیہ بیگم کچھ نہ کہہ سکیں۔ سوکھے حلق میں تھوک نگل کر رہ گئیں۔

"جناب ——— !"

لیلیٰ نے سیٹھ مکرم کو مخاطب کیا۔

"جس وقت یہاں اندھیرا ہوا تھا۔ اس وقت آسیہ بیگم نے

مجھے مین سوئچ کی طرف جانے کے لیے کہا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ شخص مجھے مار ڈالنے کے لیے اندھیرے میں کھڑا ہوا تھا۔ اور یہ محترمہ جان بوجھ کر مجھے موت کے منہ میں بھیج رہی تھیں ۔"

"تم اسے محترمہ کہہ رہی ہو ؟"

عاصم نے آسیہ بیگم کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لعنت ہے اس عورت پر ـــ یہ اپنے بھائی کو محض اس لئے یہاں ساتھ لائی تھی کہ تم یہاں تنہا رہتی ہو۔ اس لیے آسانی سے تمہیں قتل کیا جا سکتا ہے۔"

پھر اس نے سیٹھ مکرم سے کہا۔

"مکرم صاحب ـــ ! یہ سو فیصدی لیلیٰ کو قتل کرنے کی سازش تھی۔ لہٰذا ہمیں فوراً ہی پولیس کو کال کرنا چاہیئے !"

"ہم ـــ !"

انہوں نے غرا کر کہا۔

"پولیس کو بلانا ہی ہو گا۔ لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ لیلیٰ کو قتل کرنے کی سازش کی گئی تھی۔"

"تعجب ہے ـــ"

عاصم نے حیرت سے کہا۔

"پھر اس شخص نے مین سوئچ کو آف کیوں کیا تھا۔ ؟ اور یہ عورت لیلیٰ کو اندھیرے کاریڈور میں جانے کے لیے کیوں کہہ رہی تھی ـــ ؟"

سیٹھ مکرم نے آسیہ بیگم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا جواب آسی دے گی ـــ !"

آسیہ بیگم سر اٹھا کر اپنے سابقہ خاوند کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

سیٹھ مکرم نے نادانستگی میں ان کی حمایت کی تھی۔ اور اس حقیقت سے انکار کیا تھا کہ یہ قتل کی سازش نہیں ہو سکتی ـــ آسیہ بیگم کے لیے اتنا ہی سہارا کافی ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنے سابقہ خاوند کو بڑی ہی پیار بھری معصومیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مکرم ـــ ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خون خرابے سے کس طرح گھبراتی ہوں۔ میں تو اندھیرے کاریڈور میں لڑائی جھگڑے کی آوازیں سن کر ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آسکتی ہے کہ میں کسی لڑکی کو قتل ہوتے دیکھ سکوں ؟

میں افضل کو کبھی اپنے ساتھ یہاں نہ لاتی۔ لیکن اتنی رات کو تنہا یہاں آتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے افضل سے کہہ دیا تھا کہ وہ کوٹھی کے باہر کھڑا رہے ۔ مگر ـــ مگر تم ہی سوچو مکرم ! کوٹھی میں یک بیک اندھیرا ہو جائے تو ایک بھائی اپنی بہن کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ضرور کوٹھی میں داخل ہو گا۔ پھر یہ کہ افضل کبھی الیکٹرک مستری بھی رہ چکا ہے۔ اس نے بھی یہی سوچا ہو گا کہ پہلے مین سوئچ کو دیکھ لینا چاہیئے۔

افضل نے کراہتے ہوئے کہا۔

"باجی ——! یہ نیکی کا پھل ہے۔ اس نوجوان نے میری ایک آنکھ ضائع کردی ہے۔ خدا کے لیے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلیئے میں اور زیادہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتا ——"

آسیہ بیگم یک بیک کھڑی ہو کر جوشیلے انداز میں کہنے لگی۔

"یہ ظلم ہے —— یہ ظلم ہے مکرم! اگر واقعی میرے بھائی کی آنکھ ضائع ہو گئی تو میں یہی سمجھوں گی کہ تم نے مجھ سے کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لیا ہے۔

سیٹھ مکرم نے ان کو جواب دینے کی بجائے لیلیٰ سے کہا۔

جاؤ —— ! ڈاکٹر بدیع الزمان کو فون کرو۔ ان سے مختصر حالات بیان کر دینا کہ ایک آنکھ میں شدید چوٹ پہنچی ہے۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق مرہم پٹی کا سامان لے آئیں گے۔

"جی بہت اچھا ——"

لیلیٰ نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے کاغذات کو عاصم کے حوالے کر دیا۔ اور خاموشی سے سر جھکا کر فون کرنے کے لیے وہاں سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد سیٹھ مکرم نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے عاصم سے کہا۔

"تم نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ کسی پر حملہ کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ دوست ہے یا دشمن —— !"

"حملہ میں نے نہیں کیا تھا" عاصم نے کہا۔ "جیسے ہی میں نے اس پر ٹارچ کی روشنی پھینکی —— اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے —— !" افضل نے چیخ کر کہا۔ میں نے اپنی طرف ے پہل نہیں کی تھی۔ یہ نوجوان اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔"

بکواس مت کرو —— ! عاصم نے بگڑ کر کہا۔ "ورنہ اس پنسل ٹارچ ے تمہاری دوسری آنکھ بھی پھوڑ دوں گا"

"عاصم —— !" سیٹھ مکرم نے گرج کر کہا "تم حد سے آگے بڑھ رہے ہو تمہیں اس قسم کی دھمکیاں دینے کا کیا حق پہنچتا ہے؟"

"آپ دھمکیوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ مکرم صاحب —— ! میں ں کے دشمن کو کبھی زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن اس کی تقدیر اچھی ہے کہ اس وقت یہ آپ کی چھت کے نیچے ہے۔

آپ اپنے نظریئے سے اسے بے گناہ سمجھ رہے ہیں۔ لیکن میں نے حالات کے پیش نظر اسے اور اس عورت کو لیلیٰ کا جانی دشمن سمجھتا ہوں —— میری لاکھوں روپے کی جائداد پر اس عورت نے قبضہ جما رکھا ہے۔ اس جائداد کی سلامتی کے لیے یہ ایک لیلیٰ تو کیا ایسی دس لڑکیوں کو قتل کرا سکتی ہے۔ جو اس راز سے واقف ہو گئی ہوں۔"

یہ سب فضول بکواس ہے۔"

سیٹھ مکرم نے بُرا سا منہ بنا کر کہا

"تم اپنی جائداد کے سلسلہ میں آسیہ کو الزام دو گے تو کوئی عدالت ے تسلیم نہیں کرے گی۔ کیونکہ یہ خدا بخش کی بیوی ہے۔ خدا بخش نے کچھ اس کے نام لکھا ہے۔ اس نے قبول کر لیا ہے۔ ایک عورت یہ

نہیں جانتی کہ اس کے خاوند نے جو کچھ بھی دیا ہے وہ دیانت داری سے حاصل کیا ہوا ہے یا بد دیانتی سے۔ لہٰذا تم اپنے باپ کو الزام دے سکتے ہو۔ لیکن آسی کو الزام نہیں دے سکتے۔

رہ گئی راز کی بات — تو اس کے متعلق بھی سن لو۔ لیلیٰ نے آج شام کو مجھے فون کیا تھا۔ اور درخواست کی تھی وہ آج رات تمہیں یہاں بلانا چاہتی ہے۔ اس نے تفصیل یہی بتائی تھی کہ آسی تمہاری جائداد کے متعلق ایسے کاغذات لے کر آ رہی ہے۔ جن کو دیکھنے کے لیے یہاں تمہارا موجود رہنا ضروری ہے۔

لیکن عاصم ! سچ پوچھو تو میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم یہاں رات کی تنہائی میں اپنی منگیتر کے پاس آؤ اور میری کوٹھی کو عشق و محبت کا مسکن بنا لو — لیکن چونکہ تم سے اور تمہاری جائداد سے لیلیٰ کا بھی گہرا تعلق ہے۔ اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ تمہیں یہاں آنے کی اجازت تو دیدوں۔ مگر میں بھی یہاں موجود رہوں۔

بات صاف اور کھری ہے۔ لیکن میں ضرور کہوں گا کہ نوجوان لڑکے اور لڑکی کو میں تنہائی میں ملنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

پھر چائے پینے کے دوران لیلیٰ نے تمہارے سامنے اس راز کا انکشاف کیا تھا کہ آسی نے اپنے موجودہ خاوند کو یہ نہیں بتایا ہے کہ معظم اسی کا بیٹا ہے۔

"اس وقت یہ بات سن کر میں خاموش رہ گیا تھا۔ اس لیے کہ میرے سامنے اس راز کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آسی نے یہ بات

مجھے بہت پہلے ہی بتا دی تھی کہ خدابخش معظم کے وجود سے بے خبر ہے۔"

سیٹھ مکرم یہ کہتے ہوئے ذرا دیر کے لیے رک گئے۔ انہوں نے لیلیٰ کی جانب دیکھا جو فون کر کے واپس آ رہی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں"

سیٹھ مکرم نے سر ہلا کر پھر اپنی بات جاری رکھی۔

"تم لوگ ابھی بچے ہو اس دنیا کے مکر و فریب کو نہیں جانتے ہو۔ تم اس حقیقت کو بالکل نہیں جانتے ہو کہ ایک بیوہ عورت یا ایک مطلقہ عورت دوسری شادی کرنا چاہے تو لوگ اسے تو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بچے کو قبول نہیں کرتے۔"

لیلیٰ اور عاصم چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ سیٹھ مکرم انہیں بچہ سمجھ رہے تھے۔ ٹھیک ہے — وہ بچے ہی سہی۔ — لیلیٰ اور عاصم اب یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ خود انہوں نے نسیمہ کی دوسری شادی خود اس طرح جھوٹ بول کر کی ہے۔

سیٹھ مکرم کہہ رہے تھے۔

آسی اچھی طرح جانتی تھی کہ خدابخش اس سے شادی کر لے گا۔ لیکن اس کے پہلے خاوند کی اولاد کو برداشت نہیں کرے گا۔ لہٰذا آسی نے اس سے جھوٹ کہہ دیا ہے کہ پہلے خاوند سے ایک بچہ ہے لیکن وہ مر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدابخش، معظم کے وجود سے

بے خبر ہے۔

یہ راز بیلا کے علم میں آجانے کے بعد آسی کا گھبرا جانا لازمی تھا۔ لیکن گھبرا جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ بیلا کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتی ——— کیونکہ اب اس راز کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ اگر یہ راز خدا بخش کو معلوم ہو جاتے تو وہ آسی سے کچھ دنوں کے لیے ناراض ہو سکتا ہے۔ لیکن تعلقات نہیں توڑ سکتا۔ کیونکہ آسیہ کے نام آسیہ کیمیکل انڈسٹری کے مالکانہ حقوق لکھ کر اب وہ اس کا محتاج ہو گیا ہے۔

آسی کو اس بات کا خطرہ بھی نہیں ہو سکتا کہ عاصم کے ساتھ فراڈ کرنے کے کیس میں وہ ملوث ہو جائے گی۔ کیونکہ فراڈ اس نے نہیں کیا بلکہ خدا بخش نے کیا ہے۔

آسی کو اس بات کا بھی غم نہیں ہو سکتا تھا کہ عاصم اپنے باپ سے مقدمہ لڑنے کے بعد آسیہ کیمیکل انڈسٹری عاصم اپنے نام کرے گا۔ کیونکہ معظم کروڑوں کی جائداد کا وارث ہے۔ اس جائداد میں سے آسی کو بھی ایک ماں کی حیثیت سے ہر ماہ تین ہزار روپے اخراجات کے لیے ملتے ہیں۔ اس طرح خدا بخش کی دی ہوئی جائداد ہاتھ سے نکلنے کے بعد بھی وہ کسی کی محتاج نہ ہوتی ——— پھر تم ہی بتاؤ کہ وہ بیلا کو کس لیے قتل کرنے کی سازش کرتی؟

"قتل کرنا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے کہ جب جی میں آیا کسی کی زندگی سے کھیل گئے۔"

بیلا اور عاصم لاجواب ہو کر ان کا منہ تکنے لگے۔ آسیہ بیگم

اپنا پلہ بھاری دیکھ کر اب بڑبڑانے لگی تھیں اور بار بار دھمکی دیتی جا رہی تھیں کہ ان کے بھائی کی ایک آنکھ پھوٹی ہے تو وہ عاصم کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالیں گی۔

عاصم نے جھلا کر سیٹھ مکرم سے کہا۔

"آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے اس سے آسیہ بیگم کو بڑی تقویت پہنچی ہے۔ لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ افضل کی نیت میں کوئی کھوٹ تھا۔ ورنہ وہ مین سوئچ کے پاس چھپ کر کھڑا نہ رہتا۔ میں نے اس سے مقابلہ کیا ہے۔ اس لیے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے پہچان لینے کے بعد بھی اس نے مجھے مار ڈالنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ اگر میری پنسل ٹارچ سے اس کی آنکھ پھوٹ نہ جاتی تو اس کی جگہ میں تڑپتا ہوا نظر آتا۔

"مکرم صاحب ——— ! آپ میری سچائی کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ لیکن میں یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ——— کہ اس کوٹھی میں بیلا کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کسی دوسری گورنس کا انتظام کر لیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے کہ بیلا اب یہاں نہیں رہے گی ———"

"اونہہ ——— !"

سیٹھ مکرم نے حقارت سے کہا۔

"نان سنس ——— ! ایک تو تم نے غلطی کی ہے۔ افضل کو زخمی کر کے ایک جرم کیا ہے۔ اور اوپر سے مجھے دھمکی دیتے ہو کہ بیلا

یہاں ملازمت نہیں کرے گی ـــــ میں لیلیٰ جیسی ہزاروں ملازمائیں خرید سکتا ہوں ـــ نان سنس ! جی تو یہی چاہتا ہے کہ ابھی تم دونوں کو دھکے دے کر نکلوا دوں ـــــ لیکن نہیں ـــــ مجھے ابھی ڈاکٹر کا انتظار ہے ـــــ پھر اس کے بعد پولیس آئے گی اور تمہارے خلاف رپورٹ درج کرے گی کہ تم نے میرے گھر میں داخل ہونے والے ایک بے ضرر آدمی کو بری طرح مجروح کیا ہے۔

”تم جیسے دو کوڑی کے لوگوں کا مزاج کس طرح درست کیا جاتا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

عاصم نے غصہ سے ایک قدم بڑھتے ہوئے کہا۔

”میں نے بڑے ہی مہذب انداز میں لیلیٰ کو یہاں سے لے جانے کی بات کہی ہے۔ اگر آپ بھی تہذیب کے دائرے میں گفتگو کر سکتے ہیں تو کیجئے۔ ورنہ اپنی زبان کو لگام دیجئے۔ آپ کرد پڑیں ہوں گے اپنے گھر کے میں۔“

لیلیٰ نے لپک کر سامنے آ کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”عاصم ـــــ ! آپ کو میری قسم ہے۔ آپ ایک لفظ نہ کہیں بات بڑھانا دانشمندی نہیں ہے۔ آپ نے ایک بار کہہ دیا کہ مجھے یہاں ملازمت نہیں کرنا ہے۔ آپ کی یہ بات میرے حکم کا درجہ رکھتی ہے ـــــ مکرم صاحب ! ہمیں دھکے دے کر نکالیں گے۔ اس سے پہلے ہی ہم یہ کوٹھی چھوڑ دیں گے ـ لیکن عاصم ہمیں اس مصیبت کے متعلق سوچنا چاہیئے۔ جو ایک پولیس کیس کی صورت میں آپ پر مسلط ہو رہی ہے۔“

لیلیٰ کی التجا پر عاصم اپنے غصہ کو ضبط کرنے لگا۔ اسی تت کال بیل کی آواز ڈرائنگ روم میں گونجنے لگی۔

لیلیٰ کاریڈور کا دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔

”ٹھہرو ـــ !“

عاصم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم اس گھر کی ملازمہ نہیں ہو۔ لہٰذا اس گھر کے مالکوں کو زحمت گوارا کرنے دو ـــ“

سیٹھ مکرم ـ اسے غصے سے دیکھنے لگے۔ آسیہ بیگم تلملا رکھڑی ہو گئیں۔

”اچھی بات ہے“

انہوں نے عاصم کو دیکھ کر نفرت سے کہا۔

”تمہارا مزاج پولیس والے ہی درست کریں گے۔

یہ کہتی ہوئی وہ کاریڈور کی طرف چلی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ واپس آئیں۔ سیٹھ مکرم ڈاکٹر کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور حادثے کی نوعیت سمجھانے لگے۔

لیلیٰ اور عاصم ایک صوفہ پر جا کر بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر، سیٹھ مکرم کی باتیں سن رہا تھا اور افضل کی خون آلود آنکھ کا معائنہ بھی کر رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھ کی صفائی مرہم پٹی کے لیے پانی طلب کیا ـــــ اس بار بھی آسیہ بیگم کو کچن کی طرف جانا پڑا۔

سیٹھ مکرم کا بیان سن کر ڈاکٹر نے عاصم کی جانب ناپسندیدگی سے دیکھا اور سرنج نکال کر ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔

عاصم بھی اپنی لاپرواہی کا اظہار کرنے کے لئے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات کو دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر کے لیے ڈرائنگ روم کی فضا میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

عاصم کے خلاف بڑبڑانے والی آسیہ بیگم کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔

سیٹھ مکرم اپنے طور پر حالات کا جائزہ لے کر مطمئن ہو گئے تھے کہ سارا قصور عاصم کا ہی ہے۔

لیلیٰ بدلے ہوئے حالات پر حیران بھی تھی۔ اور پریشان بھی —— وہ سیٹھ مکرم جو ہمیشہ اس کی تعریفیں کیا کرتے تھے اب اچانک کس طرح بدل گئے تھے۔ اب اسے پتہ چل رہا تھا کہ یہاں گورنس بن کر آنے والی عورتیں زیادہ عرصہ تک کیوں نہیں رہ سکتیں —— ؟ اس لیے نہیں رہ سکتیں کہ یہاں آسیہ بیگم جیسی عورت اور سیٹھ مکرم جیسا دولت مند ایک ہی ذہن سے سوچتے تھے۔ اور اپنے طور پر فیصلے کرتے تھے۔

لیلیٰ کے قریب بیٹھا ہوا عاصم کاغذات کی ٹیڑھی میڑھی تحریروں میں گم ہو گیا تھا —— بظاہر تو وہ گم صم تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں میں ایک ہلکی ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ تھی اور

چہرے سے ایک ایک دبا دبا سا جوش جھلک رہا تھا۔ جیسے سمندر کی پرسکون سطح سے کوئی بہت زبردست طوفان اٹھنے والا ہو۔

پھر وہ سر اٹھا کر سیٹھ مکرم کو اور اس کے ڈرائنگ روم کو دیکھنے لگا۔

اسکی خاموش نگاہیں پوچھ رہی تھیں کہ یہ اتنا بڑا سیٹھ اور یہ لاکھوں روپے کی کوٹھی کیا اس آنے والے منہ زور طوفان کو روک سکے گی —— ؟

رات کا ایک بج رہا تھا۔

ڈاکٹر رخصت ہو چکا تھا۔ جانے سے پہلے سیٹھ مکرم نے فرمائش کی تھی کہ وہ افضل کے زخم کے متعلق طبی رپورٹ لکھ کر دے تاکہ عاصم کے خلاف یہ رپورٹ پولیس والوں کے کام آ سکے

لیلیٰ جو کسی مصیبت کے وقت نہیں گھبراتی تھی۔ اس وقت ذرا سا پریشان ہو گئی تھی۔ اور دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی کہ اس نے عاصم کو یہاں کیوں بلایا تھا۔ وہ نہ بلاتی اور نہ عاصم اس

مصیبت میں پھنسا۔"

ڈاکٹر یہ تحریری بیان دے کر چلا گیا کہ افضل کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔ اور اب وہ یک چشم ہو کر رہ گیا ہے۔

اس کے جانے کے بعد سیٹھ مکرم نے آسیہ بیگم سے کہا

"آسی ۔۔۔ ! معظم کے کمرے سے ٹیلی فون اٹھا کر لے آؤ میں تھانہ میں فون کروں گا۔"

آسیہ بیگم عاصم کے ہاتھوں میں ان کاغذات کو دیکھ رہی تھیں۔ اب تک انہیں اس بات کا اطمینان تھا کہ عاصم ان ہنگاموں کی وجہ سے ان کاغذات کو نہیں پڑھ سکا ہے۔ یوں نے انکے نکاح نامہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ لیکن وہ بھی اس راز کو معلوم نہ کر سکی تھی۔ جس کے فاش ہو جانے سے پہلے ہی آسیہ بیگم اسے تلف کرا دینا چاہتی تھیں۔

لیکن وہ کاغذات آئندہ عاصم کے پاس رہتے تو خطرہ پھر بھی باقی رہ جاتا تھا۔ اب ان کاغذات کو واپس حاصل کر لینا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

انہوں نے معظم کے کمرے کی طرف جانے کی بجائے سیٹھ مکرم سے کہا۔

"مکرم ۔۔ ! تم نے ابھی کہا تھا کہ عاصم کے ساتھ جو بھی فراڈ ہوا ہے۔ اس کی ذمہ داری خدا بخش پر عائد ہوتی ہے ۔۔۔۔ لہذا میری جائداد کے کاغذات مجھے واپس ملنے چاہئیں۔ اور میرے نکاح نامہ کا تعلق بھی عاصم سے نہیں ہے۔ اس کے باپ نے مجھ سے

شادی کی ہے تو وہ اپنے باپ سے اس نکاح نامہ کی دوسری کاپی طلب کر سکتا ہے۔"

"بے شک ۔۔ !"

سیٹھ مکرم نے عاصم سے کہا۔

"عاصم ۔۔ ! اگر تم بات نہیں بڑھانا چاہتے تو شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ آسی کے کاغذات اسے واپس کر دو۔"

"بے شک ۔۔ !"

عاصم نے سیٹھ مکرم کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"میں بات نہیں بڑھانا چاہتا۔ لیکن ان کاغذات کو واپس لینے سے پہلے آپ میرے صرف دو سوالات کے جوابات دے دیں۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ نے آسیہ بیگم سے کب شادی کی تھی

آسیہ بیگم چونک کر عاصم کو دیکھنے لگیں۔

سیٹھ مکرم نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

"نان سنس ۔۔۔ ! میری نجی زندگی کے متعلق تم سوال کیوں کر رہے ہو ۔۔ ؟

عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اگر میرے سوال سے آپ کی نجی زندگی پہ کوئی حرف آتا ہو تو برائے مہربانی ضرور جواب دیں۔

ویسے میں نے معظم کی عمر سے اندازہ لگایا ہے کہ آپ کی یہ شادی تیرہ سال پہلے ہوئی تھی ۔۔"

"ہاں ۔۔ !" انہوں نے جواب دیا۔ "تمہارا اندازہ درست

ہے۔"

"اب میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ ــــ"

عاصم نے بات ادھوری چھوڑ کر آسیہ بیگم کو طنزیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"آپ نے شادی کے کتنے سال کے بعد آسیہ بیگم کو طلاق دی تھی۔"

آسیہ بیگم اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور چیخ کر کہنے لگی۔

"یہ لڑکا بکواس کر رہا ہے ــــ مکرم ــــ! یہ ہماری نجی زندگی کے معاملات ہیں۔ تم اس کی بکواس کا جواب نہ دو۔"

عاصم نے لاپرواہی سے شانے اچکا کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مکرم صاحب! آپ میرے سوال کا جواب نہ دیں۔ مگر آپ آسیہ بیگم سے ضرور یہ پوچھیں کہ وہ گھبرا کیوں رہی ہیں؟ ان کا چہرہ زرد کیوں پڑ گیا ہے؟"

سیٹھ مکرم۔ حیرت سے آسیہ بیگم کو دیکھنے لگے۔

"واقعی آسی ــ! تم خواہ مخواہ کیوں گھبرا رہی ہو ــ؟"

"مم ــ میں کیوں گھبراؤں گی ــــ وہ ــــ میرے کاغذات آپ مجھے واپس دلا دیں"

سیٹھ مکرم ان کی گھبراہٹ کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے اچانک عاصم کی طرف سر گھما کر کہا۔

"شادی کے تین سال بعد میں نے طلاق دی تھی۔"

عاصم آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پھر اس نے بڑی ہی تلخی سے کہا۔

"مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے مکرم صاحب ــ! معظم آپ کی جائزہ اولاد نہیں ہے۔"

"نہیں ــــ!" آسیہ بیگم نے زور سے چیخ کر کہا پھر دوسرے ی لمحہ وہ ڈرائنگ روم کے باہری دروازے کی جانب بھاگنے یں۔

لیکن ان سے پہلے ہی عاصم چھلانگیں لگاتے ہوئے ان کے یب پہنچ گیا۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ کر واپس صوفوں کی جانب کھینچنے گا۔

"چھوڑ دو مجھے ــــ مجھے چھوڑ دو ــــ خدا کے لیے مجھے انے دو ــ"

وہ چیخنے اور رونے لگیں۔ لیکن عاصم نے انہیں کھینچتے ہوئے ر سیٹھ مکرم کی جانب دھکیل دیا ــــ وہ اپنا توازن نہ سنبھال سکیں ر سیٹھ مکرم کے قدموں کے قریب آ گریں۔

سیٹھ مکرم دم بخود بیٹھے رہ گئے تھے۔

عاصم کی زبان سے یہ سن کر کہ معظم جائزہ اولاد نہیں ہے وہ غصہ ں اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ تاکہ عاصم کو اس کی غلط بیانی پر برا ھلا کہہ سکیں ــــ لیکن آسیہ بیگم کو گھبرا کر بھاگتے دیکھ کر انہیں عاصم ی سچائی کا یقین ہو گیا ــــ اور جب یقین ہو گیا تو پھر ان کی ٹانگوں ں اتنی سکت نہ رہی کہ وہ کھڑے رہ سکیں ــ وہ دھپ سے بے جان ہو کر صوفہ پر گر پڑے تھے۔

آسیہ بیگم بھی ان کے قدموں سے نہ اٹھ سکی تھیں۔ عاصم نے انہیں بڑی اچھی جگہ لاکر پھینکا تھا۔ وہ یک بیک ان کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگیں۔

لیلیٰ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیلائے حیرت سے کبھی عاصم کو دیکھ رہی تھی اور کبھی آسیہ بیگم اور سیٹھ مکرم کو تکے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب سیٹھ مکرم اور آسیہ بیگم کی باقاعدہ شادی ہو چکی تھی۔ اور اس شادی کے ایک سال بعد معظم پیدا ہوا تھا تو وہ ناجائز کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بات سیٹھ مکرم کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ اس لئے سکتے میں آ گئے تھے کہ آسیہ بیگم کے آنسو اور ان کی چیخ و پکار اس حقیقت کا اعتراف کر رہی تھی۔

لاکھوں روپے صرف کرنے کے بعد ایک معظم ولا تعمیر کرایا گیا اور اس راج محل میں کروڑ روپوں کے ایک وارث کو لا کر بٹھایا گیا تھا۔ لیکن افسوس! سیٹھ مکرم سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگا کہ اب وہ کروڑوں روپے دیکر بھی اپنے بیٹے کو اپنا نہیں کہہ سکتے تھے۔

عاصم نے آسیہ بیگم کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آسیہ بیگم — اب میں یہ ثابت کروں گا کہ تم یہاں لیلیٰ کو قتل کرانے آئی تھیں۔"

آسیہ بیگم نے قدموں سے سر اٹھا کر عاصم کو دیکھا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے عاجزی کرنے لگیں۔

"خدا کے لیے مجھے تماشا نہ بناؤ۔ میں اپنے ہر جرم کا اعتراف کر لوں گی۔ میں لیلیٰ پر قاتلانہ حملہ کا اعتراف کر کے جیل جانا پسند کر لوں گی۔ لیکن عاصم اس کے بعد جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو ابھی نہ کہو مجھے یہاں سے چلے جانے دو —"

"آسی —"

سیٹھ مکرم نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"مجھ سے جتنی دور جا کر بیٹھ سکتی ہو اتنی دور چلی جاؤ — لیکن اس کمرے سے باہر نہیں جا سکتیں۔"

پھر انہوں نے عاصم سے کہا۔

"عاصم —! اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ جس بیٹے کو میں نے اپنی ساری زندگی کا حاصل سمجھ لیا تھا۔ تم نے اسے ہی ناجائز قرار دیدیا ہے۔ لیکن یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میری منکوحہ کے بطن سے ہونے والی اولاد ناجائز کیسے ہو سکتی ہے —؟"

عاصم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"حقیقت کیا ہے — میں ایک فقرہ میں بیان کر سکتا ہوں — لیکن نہیں — پہلے تھانہ میں فون کیجئے — قانون کے محافظوں کو بلا لیتے — آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے اور لیلیٰ کو یہاں سے دھکے دے کر نکال سکتے ہیں۔ پولیس کے ہاتھوں ہمیں ذلیل کر سکتے ہیں — بہتر یہی ہے کہ اب پولیس آ جائے اسی وقت فیصلہ ہوگا کہ ہم ذلیل ہوتے ہیں یا آپ دنیا والوں کی نظروں میں

تماشابن سکتے ہیں۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" سیٹھ مکرم نے کہا ۔۔۔ "تم خواہ مخواہ دھمکی دے رہے ہو۔"

"مکرم صاحب ۔۔۔! ایک ایسی عورت جس نے اپنے خاوند سے طلاق نہ لی ہو، تو اس عورت سے اگر آپ شادی کریں تو کیا یہ جرم نہیں ہوگا ۔۔۔؟

یہ عورت جو آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس نے آپ سے پہلے خدابخش سے شادی کی ہے۔ یہ نکاح نامہ دیکھ لیجئے ۔۔۔"

اس نے آسیہ بیگم کا نکاح نامہ ان کی جانب بڑھا دیا۔

وہ نکاح نامہ کی تاریخ کو حیرت سے پڑھنے لگے۔ اس تاریخ سے یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ آسیہ بیگم نے ان سے شادی کرنے کے ایک سال پہلے ہی خدابخش سے شادی کر لی تھی ۔۔۔ یعنی وہ بیک وقت دو خاوندوں کی بیوی بن کر زندگی گذار رہی تھی۔

"اتنا بڑا دھوکہ ۔۔۔!"

وہ حیرت سے منہ کھولے کبھی آسیہ بیگم کو اور کبھی عاصم کو دیکھنے لگے۔

عاصم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے یقین ہے۔ مکرم صاحب! کہ آپ دھوکہ کھا گئے ہیں، لیکن جس طرح آپ ابھی مجھ پر جھوٹا الزام عاید کر رہے تھے اس طرح میں آپ پر الزام لگاتا ہوں کہ آپ نے آسیہ بیگم سے مل کر خدابخش کو دھوکہ دیا ہے اور ان کی لاعلمی میں ان کی منکوحہ سے شادی

ہے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" سیٹھ مکرم نے بگڑ کر کہا۔ "کوئی بھی شریف آدمی کسی غیر کی منکوحہ سے شادی نہیں کر سکتا بلکہ یہ شادی بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ سراسر گناہ ہے۔"

"عشق میں اندھا ہونے کے بعد گناہ اور ثواب کو کوئی نہیں تا۔" عاصم نے کہا۔ "جب ایک عورت دو خاوند رکھ سکتی ہے تو بیچارے دو خاوند بھی ایک ہی عورت کے عشق میں گرفتار رہتے ہیں۔

بہر حال آپ اپنی جگہ کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں۔ اس عجیب و غریب شرمناک شادی کے چکر میں آپ اچھی طرح تماشا بن جائیں گے۔ دوہری شادی کا یہ واقعہ، جب اخباروں میں شائع ہوگا تو لوگ اسے ایک دلچسپ کہانی سمجھ کر دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اور حیرت کا اظہار کریں گے۔ حالانکہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر پڑھنے والے آنکھیں کھول کر اس دنیا کو گہری نظروں سے دیکھیں تو انہیں ایک نہیں بلکہ آسیہ جیسی کتنی ہی بیگمات نظر آئیں گی۔

یہ ایسی بیگمات ہیں جو اپنے شریف النفس خاوند کو فریب دیتی ہیں۔ اور عورت کے نام کو رسوا کرتی ہیں۔ ہمیں ان کی فریب کاریوں سے پوری طرح علم ہونا چاہیئے۔ اگر ہم نے اس عورت کو رسوائی سے بچانے کی کوشش کی اور آپ کے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اس واقعہ کی پردہ پوشی کی تو پھر ایسی نہ معلوم کتنی عورتیں ہیں جو ہمیں اسی طرح دھوکے دیتی رہیں گی۔ اور ہم کبھی ان کی چالبازیوں کو نہ سمجھ سکیں

گے۔

لہذا آپ آسیہ سے کہیں کہ وہ اپنے عشق و محبت کی رنگین داستان سنائیے تاکہ یہ داستان سننے کے بعد ہمیں اتنا سلیقہ تو آجائے کہ ہم شریف زادیوں اور آسیہ جیسی بازاری عورتوں کے درمیان فرق محسوس کر سکیں ــ،،

آسیہ بیگم دوزانوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپائے سسک رہی تھیں۔

سیٹھ مکرم نے انہیں نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ مگر مچھ کے آنسو پونچھ لو ــــ وہ وقت گذر چکا ہے "آسیؔ! جب تمہارے آنسو مجھے پگھلا دیا کرتے تھے ــــ آہ! محبت اندھی نہیں ہوتی۔ جوانی اندھی ہوتی ہے۔ عاصم نے صحیح اندازہ لگایا ہے کہ تمہارے عشق میں اندھا ہو گیا تھا۔ لیکن میں اسے عشق کی نہیں جوانی کی بھول سمجھتا ہوں ــ

اب تم بتاؤ کہ تم مجھے اور خدا بخش کو بیک وقت کس طرح دھوکہ دیتی رہی ہو ــ تمہاری خاموشی اور تمہارے آنسو اب مجھے متاثر نہیں کر سکیں گے۔ لہذا آنسوؤں کا پرانا ہتھیار مجھ پر استعمال نہ کرو ــ،،

آسیہ بیگم چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر ڈرائنگ روم کو خالی خالی نظروں سے تکنے لگیں

ان کا چہرہ ہر جذبہ سے عاری تھا۔ اور آنکھیں ویران سے نظر آرہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے انہیں اپنے آس پاس کسی کی موجودگی

حساس نہ ہو۔

"میں اچھی ــــ طرح ــــ سمجھ گئی ہوں ــــ،،!

ان کی آواز ان کے حلق سے نہیں کسی اندھے کنوئیں سے گونج رہی

تھی ــ

"مجھے، اپنے سیاہ کارناموں کی روداد سناتی ہی پڑے گی۔ ماضی کی سیاہی میرے چہرے پر آہی گئی ہے تو اب یہ چہرہ میں نہیں چھپاؤں گی۔

میرا چہرہ ــــ ایک سدا بہار چہرہ ہے ــــ اس چہرے پر ایک پاکباز عورت کا نکھار دیکھ کر لوگ ہمیشہ دھوکہ کھا جاتے ہیں ــــ !،،

ایک زمانہ تھا کہ جب میں جھونپڑی میں رہا کرتی تھی اور محلوں کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے میں نے سب سے پہلے یہی سوچا کہ مجھے بڑے گھرانے کی لڑکیوں اور لڑکوں سے دوستی کرنی چاہیئے ــــ اور میں نے اس پر عمل بھی کیا تھا۔

چند ایک بڑے گھرانے کی لڑکیاں میری گہری رازدار سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ان کی دوستی سے یہ فائدہ حاصل ہو گیا کہ ان کے اتارے ہوئے قیمتی ریشمی کپڑے مجھے پہننے کے لئے مل جاتے تھے کبھی کسی تقریب میں شریک ہونے کے لیے وہ اپنے زیورات بھی مجھے پہننے کو دے دیا کرتی تھیں ــــ میں رنگ و روپ میں کسی سے کم نہیں تھی زیورات اور ان کی اترن پہن کر یہ رنگ و روپ اور بھی نکھر آتا تھا۔ مجھے دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ایک لوٹے پھوٹے مکان میں رہنے والی ایک غریب لڑکی ہوں۔

پھر اونچی سوسائٹی کے نوجوان مجھ میں دلچسپی لینے لگے یعنی میں جن محلوں تک پہنچنے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ ان محلوں کے رہنے والے نوجوان اب میرے خواب دیکھنے لگے تھے۔

اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے بڑی ذہانت اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے پاس ذہانت تھی۔ لیکن تجربہ نہیں تھا۔ ابتدا میں کئی نوجوانوں کے فریب میں آ کر ٹھوکریں کھائی تھیں۔ وہ شادی کے سہانے خواب دکھا کر مجھے لوٹتے رہے اور میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی شرم و حیا کو بھی داؤ پر لگاتی رہی۔

بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر ہوں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ غلطی میں نے محسوس نہیں کی تھی۔ شمشاد بیگم نے مجھے اس کا احساس دلایا تھا۔

شمشاد بیگم ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے جو آج بھی میری دستِ راست بنی ہوئی ہے۔ وہ ایک بیوہ عورت ہے۔ ان دنوں اپنے خاوند کی چھوڑی ہوئی جائداد پر وہ کسی طرح گذارا کر رہی تھی رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا اُسے ہر ماہ دو دکانوں سے کرائے کی اتنی رقم مل جاتی تھی کہ کبھی دال روٹی کی فکر نہیں کرنی پڑتی تھی۔

لیکن وہ دال روٹی پر صبر کرنے والی عورت نہیں تھی۔ اس کے گھر میں دو نوجوان لڑکیاں تھیں۔ جو اس کی بیٹیاں بن کر اس کے ہاں رہتی تھیں۔ اور ہر ماہ اسے تین سو روپے دیا کرتی تھیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ اور کہاں سے اتنی رقم لاتی ہیں۔

شمشاد بیگم نے مجھے سمجھایا کہ لڑکیوں کو اس طرح احمق نہیں بننا چاہیئے جس طرح کہ میں ان نوجوانوں کے ہاتھوں بنتی جا رہی ہوں اس نے سب سے پہلے یہ سکھایا کہ مرد کی دولت پر بھروسہ کرو لیکن اس کی محبت کا اعتبار نہ کرو۔

بات میری سمجھ میں آ گئی میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اگر کسی نے محبت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے میں اس سے شادی کا مطالبہ کروں گی۔ کیونکہ عورت شادی کے بعد مرد کی کمائی ہوئی دولت کی حصہ دار بن سکتی ہے۔

محبت کے فریب میں آنے کا ایک تلخ تجربہ میری سہیلی کو ہو چکا تھا۔ روبی میری عزیز ترین سہیلی تھی۔ ایک دن وہ گھبرائی ہوئی سی میرے پاس آئی۔ اور اپنے لٹنے کی داستان سنانے لگی۔ لٹنے سے میری مراد یہ نہیں کہ اسے اپنی عزت کے لٹ جانے کا غم تھا۔ ہماری

سوسائٹی میں ان فضول باتوں کا ماتم نہیں کیا جاتا۔ کوئی ہمارے گریبان میں جھانک کر یہ دیکھنے نہیں آتا کہ ہم باعصمت ہیں یا نہیں — ہماری باہری چمک دمک کو دیکھ کر لوگ ہماری باطنی کمزوریوں کو بھول جاتے ہیں۔ یا پھر جان بوجھ کر نظرِ انداز کر دیتے ہیں۔

لیکن اس روز پتہ چلا کہ روبی کی باطنی کمزوری ظاہر ہونے والی ہے — یعنی وہ ماں بننے والی ہے۔

میں اس کی رازدار سہیلی تھی۔ اس نے مجھ سے التجا کی۔ کہ میں اس شخص کے پاس جاؤں اور اسے شادی پر آمادہ کروں جس کے بہلاوے میں آکر وہ ماں بن رہی تھی۔

میں اس کے بتاتے ہوئے پتہ پر وہاں پہنچی اور اس شخص سے ملاقات کی تو پتہ چلا کہ وہ بیوی بچوں والا آدمی ہے۔ جہاں اس نے شادی کی ہے، وہاں وہ گھر داماد بن کر رہتا ہے۔ اور اپنے بیٹے کے نام جو صابن کا کارخانہ ہے اس کارخانہ کا نام نہاد مالک بن کر اونچی سوسائٹی میں اپنی دولت مندی کا رعب جماتا ہے۔

آپ لوگ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ وہ خدابخش تھا۔

خدابخش سے وہ میری پہلی ملاقات تھی۔

پہلی ہی ملاقات میں میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بری طرح مجھ پر فریفتہ ہو چکا ہے۔ لیکن میرے سامنے روبی کا انجام تھا۔ اس لیے میں نے اسے لفٹ نہیں دی۔

کوئی دوسرا موقعہ ہوتا تو خدابخش مجھ پر بھی اپنی دولت مندی

کا رعب جماتا۔ لیکن روبی سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے مجبوراً اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑا کہ وہ دولت مند ضرور ہے۔ لیکن اپنی بیوی کا محتاج ہے۔ وہ نہ تو دوسری شادی کر سکتا ہے۔ اور نہ روبی کا بار اٹھا سکتا ہے۔

پہلی ملاقات میں وہ کہنے کو تو سب کچھ کہہ گیا۔ لیکن بعد میں اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اب وہ اپنی دولت کی چمک دکھا کر مجھے حاصل نہیں کر سکتا تھا — انسان کسی چیز کی آرزو کرے اور وہ چیز حاصل نہ ہو تو پھر آرزو اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

خدابخش کی بھی یہی حالت تھی کہ میں جس قدر اس سے دور رہتی تھی اس قدر وہ میرے قریب آنے کی کوشش کرتا تھا۔

پھر شمشاد بیگم نے مجھے سمجھایا کہ بعض اوقات کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔ اس لیے خدابخش کو کھوٹا سمجھ کر نظرِ انداز نہیں کرنا چاہیئے

انہوں نے مجھے نصیحت کی۔

"مرد کو احمق بنانے کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے کبھی کبھی چور نظروں سے دیکھا کرو اور جب وہ تمہاری طرف دیکھے تو نظریں پھیر لیا کرو۔

ایک عاشق کو سب سے زیادہ محبوبہ کی بے رخی تڑپاتی ہے خدابخش کو تم اپنے قریب آنے دو اور جب وہ قریب آئے تو اس سے دور ہو جایا کرو۔

اپنا تبسم اپنی دلفریب ادائیں اور اپنی توبہ شکن انگڑائیاں سب

کی سب اس کی نگاہوں کے سامنے بکھیر دو۔ لیکن اس کی دست رس سے اپنا بدن چراتی رہو۔۔۔۔ وہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جائے گا۔

شمشاد بیگم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے اس کی ایک ایک ہدایت پر عمل کیا۔ اپنی ایک ایک ادا سے اسے تڑپاتی رہی۔۔۔۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

اگر وہ خالی ہاتھ آتا تو میں شادی کی درخواست کو بھی ٹھکرا دیتی لیکن وہ میرے نام سے بیس ہزار روپے کا اکاؤنٹ کھولنا چاہتا تھا۔ یہ میری زندگی میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی سودے بازی تھی۔۔۔۔ سودے بازی اس لیے کہ خدا بخش نے بھی ایک شرط رکھی تھی اس کی یہ دوسری شادی ایک راز بن کر رہے اور اس کی پہلی بیوی کو اس شادی کی خبر نہ ہونے پائے۔

میں نے فوراً ہی رضامندی ظاہر نہیں کی۔ دوسرے دن پر بات کو ٹال کر کہ وہ میری آنٹی کے پاس آکر رشتہ کی بات طے کریں۔

خدا بخش کو میں نے یہی بتایا کہ شمشاد بیگم میری آنٹی ہیں۔ اور میں والدین کے مرنے کے بعد ان ہی کی سرپرستی میں رہتی ہوں۔

ادھر میں نے شمشاد بیگم کو بتا دیا کہ خدا بخش کل میرا رشتہ مانگنے کے لیے آئے گا۔۔۔۔ شمشاد بیگم نے بہت سوچ بچار کے بعد مجھے مشورہ دیا کہ خدا بخش کی بیوی بن جانے کے بعد اگر میری زندگی

میں کوئی دوسرا مالدار شخص آگیا تو پھر میں خدا بخش سے پیچھا نہیں چھڑا سکوں گی۔

بات واقعی سوچنے کی تھی۔ صرف بیس ہزار میں بک جانا دانشمندی نہیں تھی۔ نہ جانے وہ بیس ہزار روپے کہاں سے لایا تھا وہ خود ہی اپنی بیوی کا محتاج تھا۔ پھر وہ مجھے کیا دے سکتا تھا۔

شمشاد بیگم کے ذہن میں اس وقت ایک تدبیر آئی اس نے کہا "خدا بخش رشتہ مانگنے آئے گا تو میں بظاہر انکار کر دوں گی اور اس سے کہوں گی کہ میری بھتیجی سے شادی کرنا ہے تو پھر یہ شادی راز بن کر نہیں رہے گی۔

"ظاہر ہے کہ وہ مایوس ہو کر یہاں سے جائے گا۔ لیکن تم ان سے تنہائی میں مل کر شادی کے لیے راضی ہو جانا۔ بیس ہزار روپوں کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ہے۔ اس پر یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ جس طرح وہ اپنی بیوی سے چھپ کر شادی کر رہا۔ اس طرح تم اپنی آنٹی سے اور اپنے دوسرے رشتہ داروں سے چھپ کر اس سے شادی کر رہی ہو۔۔۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"اس ہیرا پھیری سے فائدہ کیا ہوگا۔۔۔؟

بہت سے فائدے ہوں گے۔ اس نے جواب دیا۔

سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس خفیہ شادی کے بعد بھی لوگ تمہیں کنواری لڑکی سمجھتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا بخش سے بھی زیادہ مالدار خاوند تمہیں مل جائے۔

"مالدار خاوند ـــــ ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "میں ایک شخص کی منکوحہ رہ کر دوسرے سے کس طرح شادی کر سکتی ہوں"

"بالکل اسی طرح ـــ" اس نے جواب دیا۔ "جس طرح خدابخش ایک بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دوسری خفیہ شادی کر سکتا ہے جب ایک مرد دو بیویاں رکھ سکتا ہے تو ایک عورت دو خاوند کیوں نہیں رکھ سکتی۔

خدابخش تمہیں ایک پارٹ ٹائم بیوی بنا کر رکھنا چاہتا ہے تم بھی اسے پارٹ ٹائم خاوند سمجھا کرو۔

خفیہ شادی کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ وہ اپنے شوہرانہ حقوق جتانے کے لیے یہاں نہیں آئے گا۔ چونکہ یہ شادی مجھ سے چھپ کر ہو گی۔ اس لیے وہ تم سے کہیں دوسری جگہ ملا کرے گا۔ اس طرح میرے اس گھر کا راستہ تمہارے دوسرے خاوند کے لیے ہمیشہ ہموار رہے گا۔"

مجھے شمشاد بیگم کی تدبیر بہت ہی پسند آئی۔ لہذا سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شمشاد بیگم نے خدابخش کو میرا رشتہ دینے سے انکار کر دیا اور صاف طور سے کہہ دیا کہ میری بھتیجی کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہے جو چوری چھپے شادی کرے گی ـــ انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے گھر سے نکال دیا کہ آئندہ وہ کبھی یہاں نہ آئے

عشق میں ذلت اور رسوائی برداشت ہو جاتی ہے۔ خدابخش نے بھی اس لیے اس ذلت کو برداشت کر لیا کہ میں شمشاد بیگم سے چھپ کر اس سے شادی کرنے کے لیے راضی ہو گئی تھی۔

پھر میرے اکاؤنٹ میں بیس ہزار روپے آ گئے اور ہماری شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد مجھے پتہ چلا کہ خدابخش عاصم سوپ فیکٹری کی آمدنی میں ہیرا پھیری کرتا ہے اور ماہانہ دو تین ہزار روپے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرتا رہتا ہے۔

میں نے بھی اپنے ماہانہ اخراجات کا مطالبہ کر دیا۔ شروع میں تو اس نے دو چار سو روپے دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن میں ماہانہ ہزار روپے لینے کے لیے اڑ گئی۔ میں قانونی طور سے اس کی بیوی تھی۔ اور وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ روپے جمع کر کے ہم اپنی ایک الگ کوٹھی بنائیں گے۔ اور جب یہ کوٹھی مکمل ہو جائے گی تو میں اپنی آنٹی چھوڑ کر اس کوٹھی میں ہمیشہ کے لیے چلی آؤں گی۔

وہ خود بھی چاہتا تھا کہ میں آنٹی کو چھوڑ کر الگ رہائش اختیار کروں۔ لیکن میں نے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ جب تک میں جائیداد اور کوٹھی نہ بنا لوں اپنے رشتہ داروں کو نہیں چھوڑوں گی۔ میری اس ضد کے سامنے اسے جھکنا پڑا۔ اور مجھے ہر ماہ ایک ہزار روپے ملنے لگے۔

ویسے وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر کے بری طرح پھنس گیا ہے۔ کیونکہ ہمارے درمیان کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا اور جھگڑے کے دوران میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے میرا مطالبہ پورا نہ کیا تو میں اپنا نکاح نامہ لے کر اس کی بیوی کے

پاس پہنچ جاؤں گی۔

یہ اُس کے لیے دھمکی نہیں تھی، دھماکہ تھا — پہلی بیوی کو اس خفیہ شادی کی خبر ہوتی تو وہ اسے دھکے دے کر اپنے میکے سے نکال دیتی۔ پھر نہ تو گھر داماد ہوتا۔ اور نہ ہی عاصم سوپ فیکٹری کی ہزاروں روپوں کی آمدنی نصیب ہوتی — وہ دیکھتے ہی دیکھتے کنگال ہو جاتا۔

اب اس کے سامنے یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ وہ مجھ سے جھگڑا نہ کرے، ہمیشہ صلح صفائی سے رہے اور وقت بے وقت میرے مطالبات پورے کرتا رہے۔

بہر حال وہ پوری طرح میرے شکنجہ میں آگیا تھا۔

شمشاد بیگم بھی خوش تھیں۔ ان کی ماہانہ آمدنی بھی بڑھ گئی تھی دوسری لڑکیوں کی طرح میں بھی انہیں تین سو روپیہ ماہوار دیا کرتی تھی۔

اس طرح ایک سال گذر گیا

پھر ایک دن کلب میں شور اٹھا کہ کراچی سے ایک رئیس زادہ آرہا ہے۔

کلب کے ممبر اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرنے لگے کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کا باپ تازہ تازہ مرا ہے۔ اور اس کے لیے کروڑوں کی جائداد چھوڑ کر گیا ہے۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ یہاں ایک کروڑ کی لاگت سے بے داغ فولاد کا کارخانہ قائم کرنے کے لیے آرہا ہے۔

اس کے تذکرے سن سن کر لڑکیوں کی سانسیں رکی جا رہی تھیں۔ میری بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ ذہن میں رہ رہ کر یہی احمقانہ خیال آتا تھا کہ کہیں سے کوئی طلسمی پنجرہ مل جائے اور میں اُس رئیس زادے کو اس میں قید کر لوں۔

شمشاد بیگم نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا۔

"تم خود ہی ایک طلسمی پنجرہ ہو تمہاری گرفت میں آنے کے بعد کوئی بھی شکار بچ کر نہیں جا سکتا — بس ذرا ذہانت کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسی تدبیر کرنی ہوگی کہ وہ آپ ہی آپ تمہاری طرف کھنچا چلا آئے —"

اس روز ہم تمام دن منصوبہ بناتے رہے ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ آج شام کو ہر لڑکی نت نئے انداز میں سج دھج کر کلب میں آئے گی۔ اور اس رئیس زادے سے لفٹ لینے کی کوشش کرے گی۔

بہت سوچ بچار کے بعد شمشاد بیگم نے فیصلہ کیا کہ کلب میں اتنی ساری ماڈرن لڑکیوں کے درمیان اگر میں خالص مشرقی طرز کا سنگار کر کے جاؤں تو اس رئیس زادے کو میں بہت ہی انوکھی چیز نظر آؤں گی۔

شمشاد بیگم کا یہ مشورہ بڑا ہی عجیب سا تھا۔ لیکن دل اسے تسلیم کرتا تھا۔ نفسیاتی پہلو سے سوچا جائے تو انسان کو وہی چیز متوجہ کرتی ہے جو ماحول کے بالکل برعکس ہو۔

ماحول کے بالکل برعکس میں نے سنگار کیا۔ یہ تو کلب میں پہنچنے

کے بعد مجھے پتہ چلا کہ میں کسی حد تک کامیاب رہی ہوں۔ میں سفید جسیٹ پاجامہ، سفید کرتا اور سفید دوپٹہ میں ملبوس تھی زیورات بھی سفید چاندی کے تھے۔ رنگ برنگے۔ لباس پہنی ہوئی لڑکیوں کے درمیان میں ایک سفید تازہ گلاب کی طرح کھلی ہوئی تھی۔

رئیس زادہ خالص کاروباری قسم کا آدمی تھا۔ کلب میں بھی وہ محض اپنے ایک وکیل سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اور زیادہ تر اسی سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ کلب کی کسی لڑکی سے اس نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن آدمی چاہے کسی مزاج کا ہو۔ وہ عجیب سی چیز کو دیکھ کر ضرور متوجہ ہوتا ہے۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ وکیل سے گفتگو کرنے کے دوران کئی بار مجھے کنکھیوں سے دیکھ چکا ہے۔

پھر ڈانس کے لیے آرکسٹرا شروع ہوا تو اسے مجبوراً اور اخلاقاً ڈانس کے لیے اٹھنا پڑا۔ کتنی ہی لڑکیاں تھیں۔ جو اس کے ساتھ رقص کرنے کی منتظر تھیں۔ لیکن وہ تمام لڑکیوں کے درمیان سے گذرتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور رقص کرنے کے لیے درخواست کرنے لگا ــــ

میں نے مسکرا کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ڈانس فلور پر چلی آئی۔

یہ مکرم سے میری پہلی ملاقات تھی۔

کسی کی محبت پا کر اور کسی کی صحبت میں وقت گذار کر یوں لگتا ہے۔ جیسے وقت کے پر لگ گئے ہیں۔

مکرم کے ساتھ ایک مہینہ کس طرح گذر گیا، مجھے پتہ نہیں چلا۔ ہم دن بدن ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے کہ اب ایک دوسرے سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مکرم مجھے دل و جان سے چاہنے لگے تھے اگر وہ جائداد کے جھگڑوں میں الجھے نہ ہوتے تو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ میرے ساتھ گذارتے ــ میرے لیے بھی یہ بہتر ہی تھا کہ وہ صرف میری زلفوں میں نہیں۔ بلکہ اپنے مسئلوں میں الجھے رہیں۔ اس طرح مجھے خدا بخش سے ملنے کا وقت مل جاتا تھا۔

ان دنوں کروڑپتی مکرم کے سامنے خدا بخش ایک حقیر ذرہ نظر آتا تھا۔ لیکن شمشاد بیگم کی نصیحتوں کے مطابق میں ابھی اس کھوٹے سکے کو پھینکنا نہیں چاہتی تھی ــــــ کچھ بھی ہو، وہ ایک کروڑپتی نہ سہی، ایک ہزار روپے ہر ماہ باقاعدگی سے ادا کر رہا تھا۔

مکرم سے ابھی نقد روپوں کا تقاضا مناسب نہیں تھا میرے لئے یہی بہت تھا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے روز ہزاروں روپے

کی شاپنگ کرادیا کرتے تھے۔

پھر ایک روز انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ دنوں کیلئے کراچی واپس جارہے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اتنی اچھی طرح شکنجہ میں آکر یونہی نکل جائیں ——— میں اچانک ہی ان کے سامنے یوں رونے لگی۔ جیسے ان کے جاتے ہی اس طرح رو رو کر اپنی جان دے دوں گی۔

میں نے محبت کے پرانے مکالمے دہراتے ہوئے کہا۔

"مکرم ——— میں تمہاری محبت میں اتنی دور چلی آئی ہوں کہ اب واپس نہیں لوٹ سکتی۔ تم اگر مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔"

انہوں نے میرے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"آسی ——— تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہارے بغیر سکون سے رہ سکوں گا۔ میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

میں خوش ہوگئی۔ لیکن پھر میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کس طرح لے جاؤ گے مکرم؟ آنٹی کبھی اجازت نہیں دیں گی۔"

مکرم مسکرا کر کہنے لگے۔

"اگر میں تمہیں دلہن بنا کر لے جاؤں تو آنٹی بھلا کس طرح روک سکتی ہیں۔"

میں نے شرما کر منہ پھیر لیا ——— منہ پھیرنے کی ضرورت اس

لیے پڑ گئی کہ دراصل میں شرما نہیں رہی تھی۔ بلکہ گھبرا رہی تھی۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقعہ آرہا تھا کہ میں ایک کی بیاہتا ہو کر دوسرے سے بیاہ کرنے والی تھی۔

مکرم نے مجھ سے کہا۔

"کل میں تمہاری آنٹی کے پاس آکر تمہارا رشتہ مانگوں گا۔ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ ——— پھر میں جہاں چاہوں گا۔ تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔"

شام کے وقت گھر واپس آکر میں نے آنٹی سے بتایا کہ دوسرے دن مکرم شادی کے معاملات طے کرنے آرہے ہیں۔

ہم دونوں پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ آنے والا کل ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

شمشاد بیگم نے بڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"ہم مکرم کے متعلق زیادہ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ جو کچھ اس نے بتایا ہے اس کی روشنی میں اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے کہ اسے کروڑوں کی جائداد ملنے والی ہے۔

لیکن وہ جائداد اسے ملے گی بھی یا نہیں ——— یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس جائداد کے سلسلے میں اس کے سوتیلے بھائیوں سے مقدمہ بازی ہورہی ہے۔

مکرم کی ایک ناکامی ظاہر ہوچکی ہے کہ وہ یہاں بے داغ فولاد کا کارخانہ قائم کرنے آیا تھا۔ لیکن اس کے بھائیوں نے قانون کا سہارا لے کر اسے روک دیا ہے کہ جب تک مقدمہ کا فیصلہ

نہیں ہوگا۔ وہ باپ کے روپوں سے کارخانہ قائم نہیں کر سکے گا۔

بہرحال اس ناکامی کے باوجود مجھے یقین ہے کہ اسے اپنے باپ کی جائداد سے حصہ ضرور ملے گا۔ ایک کروڑ نہ سہی۔ پچاس لاکھ روپے تو ضرور ملیں گے۔

لہذا تمہیں یہ شادی کرنی چاہیئے۔ لیکن شادی کی پہلی شرط یہی ہوگی کہ تم یہ شہر چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ وہ رئیس آدمی ہے اس لیے ہر ہفتہ ایئرپلین سے یہاں تمہارے پاس آ سکتا ہے۔ پھر یہ مقدمہ جیتنے کے بعد وہ خود ہی یہاں کاروبار کرنے کے لیے مستقل طور سے رہ سکتا ہے اگر تم مجبور کرو ——— یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ یہاں رہ کر تمہیں خدابخش کو بھی سنبھالنا ہے۔ میری اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو کہ ساری روٹی کی لالچ میں آدھی روٹی کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ہے۔

بہرحال مکرم خود بھی یہاں ایک کارخانہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے تمہاری اس شرط کو تسلیم کرے گا۔

دوسری شرط یہ کہ مہر کی رقم پچاس ہزار روپے ہوگی۔ اور یہ رقم شادی کی رات ہی مکرم کو ادا کرنی ہوگی۔

یہ تمہارے لیے ایک سنہری موقعہ ہے۔ مکرم کا اپنا کوئی سگا رشتہ دار نہیں ہے۔ جو بھی ہیں سب سوتیلے ہیں۔ وہ لوگ تمہارے متعلق کوئی چھان بین کرنے یہاں نہیں آئیں گے۔

تیسری شرط یہ کہ شادی کے بعد مکرم اس گھر میں داماد کی حیثیت سے آ سکتا ہے۔ تمہارے ساتھ رات گذار سکتا ہے۔ لیکن تمہاری رخصتی

کا تقاضا نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ تمہارے لئے ایک کوٹھی اور جائداد نہ بنا لے میں ایک سرپرست کی حیثیت سے تمہیں یہاں سے رخصت نہ کروں گی ——— اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مکرم یہاں تمہارے سر پر ہمیشہ مسلط نہیں رہے گا۔ تم جب چاہو گی مناسب موقعہ نکال کر خدابخش سے مل لیا کرو گی ——"

شمشاد بیگم بہت ہی تجربہ کار عورت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ محبت اندھی ہے۔ مکرم آنکھیں بند کر کے ان شرائط کو منظور کر لیں گے۔

دوسرے دن یہی ہوا کہ مکرم نے شرائط منظور کر لیں کہ وہ اسی شہر میں کاروبار کریں گے اور جب تک میرے لیے کوٹھی نہیں بنائیں گے۔ میری رخصتی کا تقاضا نہیں کریں گے وہ خود بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں کراچی جا کر ان کی سوتیلی والدہ کے زیر سایہ رہوں ——

مہر کے لیئے پچاس ہزار کی رقم بھی انہوں نے بہ آسانی منظور کر لی مختصر یہ کہ شادی کی رات کو ہی انہوں نے یہ رقم ادا کر دی اور آنٹی کے ہاں میرے ساتھ رہنے لگے۔

لیکن ان کی رہائش مستقل نہیں ہوتی تھی۔ وہ مقدمہ کے سلسلہ میں زیادہ تر کراچی جایا کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک آدھ دن کے لیے آتے تھے اور میرے ساتھ وقت گذار کر چلے جاتے تھے۔

مقدمہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ مکرم کبھی بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرتے تھے کہ وہ مقدمہ جیت جائیں گے۔ اور کبھی بہت زیادہ مایوس ہو جاتے تھے۔ باپ کی جائداد حاصل کرنے میں ناکامی کا اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اکثر مایوس ہو جاتے تھے۔

میں دونوں خاوندوں کے ساتھ انصاف کر رہی تھی اور اب تک میں نے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ لیکن ایک صبح میں بہت بڑی الجھن میں گرفتار ہو گئی۔

میں مکرم کے ساتھ سوئی تھی۔ صبح اٹھی تو یک بیک میری طبیعت خراب ہو گئی۔ میرا جی متلا رہا تھا۔ اور ہر متلی کے بعد ایسی کمزوری محسوس ہوتی تھی کہ سر چکرانے لگتا۔

مکرم نے فوراً ہی لیڈی ڈاکٹر کو طلب کر لیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد خوشخبری سنائی کہ مکرم صاحب باپ بننے والے ہیں۔ مکرم کے لیے یہ خوشخبری ہو سکتی تھی لیکن مجھ پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔

اگر اس وقت مکرم موجود نہ ہوتے اور لیڈی ڈاکٹر تنہا ہوتی تو میں اس سے ساز باز کر کے مکرم کو پتہ ہی نہیں چلنے دیتی کہ ماں بننے والی تھی۔

لیکن اب تو یہ بات مکرم کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اب میں اس بچے کو ضائع نہیں کر سکتی تھی۔

میں اس الجھن میں گرفتار ہو گئی —— الجھن کی بات ہی تھی۔ اب دونوں خاوند اس بات کا دعویٰ کر سکتے تھے کہ وہ بچہ ان کا ہے —— میں ماں بننے کے بعد بچہ کس کے حوالے کرتی؟ مکرم کے حوالے یا خدا بخش کے ——؟

شمشاد بیگم نے مجھے مشورہ دیا کہ فی الحال گھبرانے کی بات نہیں ہے ابھی مکرم اور خدا بخش کو باری باری یقین دلایا جائے کہ یہ بچہ انہی

کا ہے۔ پھر جیسے ہی مکرم کراچی جائیں گے۔ اسی وقت پہلی فرصت میں بچے کو ضائع کر دیا جائے گا۔ اکثر حادثوں میں حمل ضائع ہو جاتا کرتا ہے۔ اس لیے دونوں خاوندوں کو کسی قسم کا پتہ نہیں ہو گا۔

خدا بخش کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ باپ بننے والا ہے تو اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔ یعنی وہ بچوں کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

لیکن مکرم خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ انہوں نے کراچی جاتے وقت مجھ سے کہا۔

"مجھے مقدمہ جیت لینے دو۔ میں ایک کروڑ کی لاگت سے یہاں بے داغ فولاد کا کارخانہ قائم کروں گا۔ اور یہ کارخانہ تمہارے بیٹے کے نام پر ہو گا۔"

میں ایک دم سے آسمان کی بلندیوں پر اڑنے لگی —— میں نے اب تک اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ میرے بطن سے ہونے والی اولاد کروڑوں کی جائداد کی جائز وارث ہو گی۔

یک بیک میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ یعنی اب ادھر کی دنیا ادھر ہو جاتی تب بھی بچے کو ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ وہ میرے لیے ایک بچہ نہیں تھا بلکہ بے داغ فولاد کا ایک عظیم منصوبہ تھا۔

خدا بخش کے سامنے میں نے دوسرا ناٹک کھیلا —— وہ بیچارہ تو یہ جانتا تھا کہ میں نے گھر والوں سے چھپ کر اس سے شادی کی ہے —— لہذا میں نے اسے بتایا کہ میرے ماں بننے پر گھر والے

بدنامی سے گھبرا رہے ہیں۔ اور مجھے بُرا بھلا کہہ رہے ہیں اب آنٹی مجھے اپنے گاؤں لے جائیں گی۔ اور زچگی کے بعد اس بچے سے نجات حاصل کر لیں گی۔ اس طرح سوسائٹی میں کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ میں کبھی ایک بچے کی ماں بنی تھی۔

خدا بخش خود ہی یہ چاہتا تھا کہ بچے نہ ہوں۔ پہلی بیوی سے اس کے اتنے بچے تھے کہ وہ ان سے عاجز آ گیا تھا۔ لہٰذا میرے گاؤں جانے پر اس نے اعتراض نہ کیا۔

اب میرے لیے تمام راستے ہموار تھے۔

میں نے مکرم کو خط لکھ دیا کہ میں زچگی ہونے تک اپنے گاؤں میں رہوں گی۔ کیونکہ وہاں کی آب و ہوا مجھے راس آتی ہے لہٰذا وہ مجھے وہاں آ کر ملا کریں۔

خدا بخش کی طرف سے اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ وہ انٹی کا سامنا کرنے کے لیے گاؤں آئے گا۔ انٹی کا پلان یہی تھا کہ بچے کو اپنے ہاں لا کر رکھ لیں گی اور خدا بخش پر یہ ظاہر کر دیا جائے گا کہ بدنامی کے خیال سے بچہ ضائع کر دیا گیا ہے۔

دراصل اس دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں ہے اور خاص کر مردوں کو بے وقوف بنانا تو بڑی آسان سی بات ہے۔ کیونکہ مردوں کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ عورتوں کو اپنے مقابلہ میں کم عقل سمجھتے ہیں۔ جب تک ان کا یہ نظریہ رہے گا۔ وہ ہمیشہ ہماری ذہانت سے احمق بنتے رہیں گے۔

یہ بات مردوں کو زہر لگے گی۔ لیکن میں خدا بخش جیسے لوگوں سے

پوچھتی ہوں کہ وہ دنیا والوں سے چھپ کر دوسری شادی کیوں کرتے ہیں؟ وہ اس حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ عورت بھی ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دوسرا عاشق یا دوسرا خاوند رکھ سکتی ہے۔

میں مکرم جیسے لوگوں سے پوچھتی ہوں کہ وہ محبت میں اندھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ سے شادی کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق کیوں نہیں کرتے کہ اس لڑکی کے ماں باپ کون ہیں۔؟

یہ انٹی کہاں سے پیدا ہو گئی ہے — ؟ یہ کیسی انٹی ہے کہ اپنی بھتیجی کو اس کے خاوند کے ساتھ رخصت نہیں کرتی، اپنے ہی گھر میں پال کر رکھتی ہے۔ اور یہ پچاس ہزار کی رقم شادی کی رات کو گنوا دیتی ہے۔

—— دراصل ان مردوں کو کچھ تو دولت اندھا کر دیتی ہے اور کچھ محبت انہیں دیوانہ بنا دیتی ہے۔ وہ زبانی اپنی دانشمندی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن عمل کا جہاں تک تعلق ہے وہ عقل سے کورے ہیں۔

بہرحال۔ معظم پیدا ہوا —— ایک بہت بڑے کارخانہ کا مالک —— لیکن ابھی کارخانہ کا منصوبہ ہی بنا تھا۔ کیونکہ ابھی تک مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

معظم کی پیدائش کے چار ماہ بعد عدالت نے فیصلہ سنا دیا —— اور وہ فیصلہ مکرم کے خلاف تھا۔

دراصل قصہ یہ تھا کہ مکرم کے والد نے کسی بات سے ناراض ہو کر مکرم کو فرزندی سے عاق کر دیا تھا۔ ان کی موت بھی اچانک ہوئی تھی۔

کہ اپنے پیچھے وہ کوئی مستند وصیت نامہ نہیں چھوڑ سکے تھے لہٰذا سوتیلے بھائیوں نے مقدمہ جیت لیا تھا۔

مکرم کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ مل سکی وہ تو اس حد تک قلاش ہو گئے تھے کہ کوئی دوسرا کاروبار کرنے کے لیے وہ مجھ سے پچاس ہزار روپے مانگنے لگے —— وہی پچاس ہزار روپے جو انہوں نے مہر کے طور پر شادی کی رات ادا کیے تھے۔

میں اتنی نادان تو نہیں تھی کہ ہاتھ آئی ہوئی رقم لوٹا دیتی مجھے تو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ کارخانہ کا مالک بنانے کی خوش فہمی میں میں نے خواہ مخواہ ایک بچے کی مصیبت مول لی ہے۔

میں نے پچاس ہزار روپے کی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ ایک قلاش آدمی سے مجھے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ میں نے رقم دینے کی بجائے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

مکرم میری طوطا چشمی پر حیران رہ گئے۔ پہلے تو انہوں نے یہی سمجھا کہ اس ناکامی سے میں وقتی طور پر بدحواس ہو گئی ہوں۔

انہوں نے مجھے سمجھانے منانے کی لاکھ کوششیں کیں کہ میں طلاق کا مطالبہ نہ کروں لیکن میں اپنے فیصلہ پر قائم رہی۔

میری بے وفائی اور بے مروتی دیکھ کر ان کا دل ٹوٹ گیا ایک تو مقدمہ کی ناکامی اور دوسرے میری بے وفائی وہ بڑی تلخی سے مسکرانے لگے اور پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے انہوں نے مجھے طلاق دے دی۔

ہمارا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ اور جب یہ رشتہ ٹوٹ گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"آج مجھے معلوم ہوا کہ مصیبت میں اپنے بھی کس طرح ساتھ چھوڑ دیتے ہیں لیکن آسی —— تم نے وہ مثل تو سنی ہوگی کہ ہاتھی مرے بھی تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے —— میں بالکل ہی مردہ نہیں ہوں اس وقت بھی میرے پاس سوا لاکھ روپے ہیں۔"

میں چونک کر انہیں دیکھنے لگی انہوں نے مسکرا کر کہا۔

یہ سچ ہے کہ اباجان نے مجھے فرزندی سے عاق کر دیا تھا۔ لیکن میری والدہ مرحومہ نے اپنی موت سے پہلے اپنی تمام جائداد میرے نام لکھ دی تھی۔ مجھے اپنے کاروبار کے لیے دو لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔ سوا لاکھ میرے پاس ہیں۔ پچاس ہزار روپے میں نے تم سے مانگے تھے مگر تم نے انکار کر دیا۔ بہرحال میں جائداد کو بیچ کر یہ کمی پوری کر سکتا ہوں۔

بہرحال کچھ عرصہ بعد تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا کہ تم نے اپنے خاوند کی قدر نہیں کی —— میں جا رہا ہوں —— میں اپنی ضد کا پکا ہوں —— تم دیکھ لینا ایک دن یہاں بے داغ فولاد کا کارخانہ قائم کروں گا۔ اور پھر معظم کو آ کر لے جاؤں گا اس وقت تک اس کی پرورش کے لیے تمہیں ہر ماہ ایک ہزار روپے باقاعدگی سے ملتے رہیں گے۔"

یہ کہہ کر مکرم ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گئے۔

میں اور شمشاد بیگم ایک دوسرے کا منہ تکتی رہ گئیں ہم نے جلدبازی میں بہت ہی غلط فیصلہ کیا تھا لیکن اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا —— مکرم تیر کی طرح کمان سے نکل چکا تھا۔

اتنا کہنے کے بعد آسیہ بیگم نے عاصم اور ریلی کی جانب دیکھا پھر چور نظروں سے سیٹھ مکرم کو دیکھنے لگی۔

وہ بے داغ فولاد کے بہت بڑے کارخانہ کا مالک سر جھکائے بیٹھا تھا۔

ان کے کارخانہ سے نکلنے والا فولاد بے داغ تھا۔ لیکن انکے خون سے تخلیق ہونے والا معظم داغدار بن گیا تھا۔

ڈرائنگ روم میں ایک طویل خاموشی چھاگئی۔ سب کے سب دم سادھے یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے سانس لینا بھول گئے ہوں۔

پھر سیٹھ مکرم نے ایک گہری سانس لینے کے بعد کہا۔

آج مجھے معلوم ہوا کہ عورت فریب دینے پر آئے تو مرد کو کنگال بنا دیتی ہے۔ ایک دولت مند کی سب سے بڑی دولت اس کا بیٹا ہوتا ہے اس کی دولت کو خرچ کرنے والا ۔ اس کی دولت کی حفاظت کرنے والا۔ اور اس کی دولت کو آئندہ نسلوں

تک دائم اور قائم رکھنے والا اس کا بیٹا ہی ہوتا ہے ___ آسی! تم نے وہ بیٹا بھی مجھ سے چھین لیا۔

ظالم عورت! ڈاکو بھی لوٹ کر جاتے ہیں تو اپنے پیچھے لٹنے والے کے لیے کچھ نہ کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں۔ مگر تم نے تو میرے بڑھاپے کا آخری سہارا چھین لیا ہے۔

اب میں کیسے اپنا کہوں ___؟

"کس طرح فخر سے گردن اٹھا کر کہوں کہ معظم میرے خون سے تخلیق ہوا ہے ___!

آسیہ بیگم سر جھکائے رو رہی تھی۔

انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں ظالم ہوں ___ بے حیا اور بے شرم ہوں۔ میں نے قدم قدم پر تم سے بے وفائی کی ہے تمہیں دھوکے دیئے ہیں مگر مکرم! آج میں زندگی میں پہلی بار سچ بول رہی ہوں پہلی بار خدا کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ معظم آپ کا بیٹا ہے اس کا خدا بخش سے کوئی تعلق نہیں ___"

"بکواس مت کرو ___!"

سیٹھ مکرم نے چیخ کر کہا۔

"کیا اب بھی تمہیں یقین ہے کہ تم اپنے بیٹے کو کروڑوں کی جائداد کا وارث بنا کر عیش کر سکو گی ___؟ مکار عورت اب میں تمہارے فریب میں نہیں آؤں گا ___ میں ___ میں تمہیں شوٹ کردوں گا ___"

یہ کہتے ہوئے اچانک انہوں نے ریوالور نکال لیا۔ لیکن
اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتے ۔۔۔ آسیہ بیگم چیختی ہوئی عاصم
کے پیچھے چلی گئیں۔

انہوں نے للکار کر کہا۔

"عاصم ۔۔۔ ہٹ جاؤ، سامنے سے ۔۔۔"

وہ عاصم سے لپٹ گئیں۔

"نہیں عاصم ۔۔۔! خدا کے لیے مجھے بچا لو ۔۔۔ میں سوتیلی
ہی سہی۔ مگر تمہاری ماں ہوں"

عاصم نے سخت لہجے میں کہا۔

ماں کے مقدس نام کو بدنام نہ کرو ۔۔۔ تمہاری جیسی بازاری عورت
میری ماں نہیں بن سکتی۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے انہیں الگ کر دیا
سیٹھ مکرم نے یہی سمجھا تھا کہ وہ آسیہ بیگم کو دھکا دے کر
ان کے نشانہ پر رکھ دے گا۔

لیکن اس نے آسیہ بیگم سے الگ ہوتے ہی ان کے ریوالور
پر ٹھوکر ماردی۔ ریوالور ان کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔
سیٹھ مکرم اسکی اس حرکت پر لمحہ بھر کے لیے بوکھلا سے گئے
عاصم نے تیزی سے لپک کر ریوالور کو قالین پر سے اٹھا
لیا۔ پھر سیٹھ مکرم سے کہنے لگا۔

"اس عورت کی یہی سزا ہے کہ یہ قتل کر دی جائے۔ اور
آپ ہی کے ہاتھوں سے قتل کی جائے۔ کیونکہ اس نے صرف

آپ کو ہی نہیں بلکہ آپ کی آئندہ نسل کو تباہ کر دیا ہے اسے طلاق
دینے کے بعد آپ کو جس اولاد پہ ناز تھا۔ اب وہ اولاد بھی آپ
کی نہیں رہی۔

"لیکن مکرم صاحب ۔! اس عورت کی موت سے مجھے نقصان
پہنچے گا۔ میں اسے زندہ رہنے کا موقع دوں گا۔ اور عدالت
میں یہ ثابت کروں گا کہ ایک عورت کے بیک وقت دو
نکاح جائز نہیں ہوتے۔ لہذا میرے والد سے حاصل کی ہوئی
آسیہ کیمیکل انڈسٹری بھی اس عورت کی ملکیت نہیں ہو
سکتی۔ اس پر صرف میرا حق ہے۔"

سیٹھ مکرم نے اس کی جانب ہاتھ بڑھا کر کہا۔

ریوالور مجھے دو ۔۔۔ میرے سینے میں انتقام کی جو آگ بھڑک
رہی ہے میں اسے سرد کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔ آسیہ کیمیکل انڈسٹری
کی فکر نہ کرو۔ ابھی کھڑے کھڑے دام لگاؤ میں تمہیں چیک
لکھ کر دیتا ہوں۔ چیک لو اور جا کر عیش کرو ۔۔۔"

عاصم نے مسکراتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

آپ بڑے مہربان ہیں مکرم صاحب! کبھی ہمیں دھکے دے کر
یہاں سے نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں اور کبھی لاکھوں روپے کا
چیک دیکر احسان جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے میں بے یار و مددگار تھا آپ مجھ پر سنگین
الزامات عائد کر کے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے اب آپ
نے اس عورت سے خفیہ شادی کر کے قانون اور مذہب کا مذاق

اڑایا ہے۔''

''میں نے خفیہ شادی نہیں کی تھی۔''

انہوں نے چیخ کر کہا۔

''یہ بات آپ عدالت میں کہیں گے۔

''آپ مجھے تھانہ تک پہنچانا چاہتے تھے میں آپ کو عدالت تک پہنچاؤں گا آپ جیسے کروڑپتی کو تماشا بنا کر رکھ دوں گا۔

سیٹھ مکرم پریشان نظروں سے اسے تکنے لگے۔

لیلیٰ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی عاصم کے قریب آ گئی۔

پھر اس نے عاصم کا بازو تھام کر بڑی نرمی سے کہا۔

خدا کے لیے آپ بات نہ بڑھائیں۔ سیٹھ صاحب غلط فہمی کی وجہ سے آپ کو پولیس کی دھمکی دے رہے تھے آپ اسے بھول جائیں، غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔''

''نہیں لیلیٰ ۔۔۔!'' عاصم نے اپنے بازو سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ تم ان معاملات میں نہ بولو ۔۔۔ میں کسی کی نہیں سنوں گا۔۔۔''

لیلیٰ کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ زندگی میں پہلی بار عاصم نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا یہ پہلا موقعہ تھا کہ عاصم نے اسے اہمیت نہیں دی تھی ۔۔۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

سیٹھ مکرم نے عاصم سے کہا۔

''عاصم ۔۔۔! مجھے پورا یقین ہے کہ میں کسی قانونی گرفت میں

نہیں آ سکتا، مجھے صرف اس بات کی پریشانی ہے کہ اس ذلیل عورت کی وجہ سے میں بھی عدالت میں تماشا بن جاؤں گا اخباروں میں اس عورت کے ساتھ میرا بھی نام آئے گا۔ میں نے اتنے برسوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد جو دولت، شہرت، اور عزت حاصل کی ہے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے رسوائی میں بدل جائے گی۔

جب تک میرے ہاتھ میں پستول تھا اس وقت تک میں بھی بھول گیا تھا کہ اس عورت کا قاتل بن کر میں اور زیادہ بدنام ہو جاؤں گا۔ اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں اسے قتل نہیں کروں گا۔ تم بھی میرے خلاف انتقامی کارروائی کے ارادوں کو بھول جاؤ تو بہتر ہے۔ ہم یہاں بیٹھ کر ٹھنڈے دماغ سے سوچتے ہیں کہ کس طرح تمہیں کھوئی جائیداد مل سکتی ہے اور کس طرح میں آنے والی بدنامیوں سے محفوظ رہ سکتا ہوں۔

عاصم کی بجائے لیلیٰ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

سیٹھ صاحب ۔! مجھے جانے کی اجازت دیجئے یہ آپ لوگوں کے معاملات ہیں۔ میں اپنی موجودگی مناسب نہیں سمجھتی۔''

اسے آنسو پونچھتے دیکھ کر اچانک عاصم کو احساس ہوا کہ اس نے لیلیٰ کی بات نہ مان کر اس کا دل دکھایا ہے۔

سیٹھ مکرم نے اس سے کہا۔

لیلیٰ ۔۔۔! ان معاملات کا تم سے گہرا تعلق ہے اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آسی نکاح نامہ کی تاریخ کو چھپانے کے لیے تمہیں قتل کرانا چاہتی تھی۔

لیلیٰ نے جواب دیا۔

"آسیہ بیگم نے میرے خلاف جو بھی حرکتیں کی ہیں میں انہیں بھلا چکی ہوں، مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔

عاصم نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

پھر اس نے بڑی محبت سے پوچھا۔

لیلیٰ ـــ! مجھ سے ناراض ہو گئی ہو ـــ؟"

اس نے منہ پھیر کر جواب دیا۔

"میں کون ہوتی ہوں آپ سے ناراض ہونے والی، آپ کے معاملات میں دخل دینے والی ـــ!

تم ہی تو میری سب کچھ ہو لیلیٰ ـــ! نہ جانے میں جوش و جنون کی حالت میں کیا کہہ گیا۔ اسے بھول جاؤ ـــ یہ دیکھو! میں مصلحت سے کام لے رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ریوالور کے چیمبر سے گولیاں نکالنے لگا اس کے بعد خالی ریوالور مکرم کو دے کر اس نے گولیوں کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔

پھر اس نے کہا۔

"مکرم صاحب! آسیہ نے آپ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے۔ اس سے ہمیں اب کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آسیہ کے پاس میری جو جائیداد ہے۔ وہ مجھے واپس مل جائے

سیٹھ مکرم نے جواب دیا۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ دو دن کے اندر تمہیں آسیہ کیمیکل [illegible]ٹری کے مالکانہ حقوق مل جائیں گے۔"

آپ کا بہت بہت شکریہ"

عاصم نے کہا۔

"ہم اور کچھ نہیں چاہتے ـ اب ہمیں اجازت دیجئے کل میں آپ [illegible] آفس میں آ کر ملوں گا۔

پھر اس نے لیلیٰ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آؤ لیلیٰ ـــ! اب اس معظم ولا میں ہمارا کوئی کام نہیں [illegible]ہے ـــ"

"معظم ولا ـــ!" سیٹھ مکرم کے سینے سے ایک آہ نکلی [illegible] کتنے ارمانوں سے انہوں نے اس شاندار کوٹھی کا نام معظم ولا [illegible]تھا ـــ لیکن اب یہی نام ایک گالی بن کر ان کے ذہن [illegible]چپک گیا تھا۔

عاصم اور لیلیٰ کوٹھی سے باہر آگئے۔

باہر پچھلے پہر کا چاند نکل آیا تھا سرد ہوائیں بھرے لان کی خوشبوئیں [illegible]کر ان کے قریب بھٹک رہی تھیں۔

لیلیٰ چلتے چلتے رک گئی

پھر اس نے بڑے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

"لیکن ـــ میں جاؤں گی کہاں ـــ؟ میرا گھر کہاں ہے!

عاصم بھی سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی پہلے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی [illegible]ی کہ لیلیٰ کا ٹھکانہ کہاں ہو گا ـــ؟

وہ عاصم کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی
وہ معظم ولا میں نہیں رہ سکتی تھی۔
وہ اپنی ماں کی سسرال میں نہیں رہ سکتی تھی۔
عاصم نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"فی الحال تمہیں اپنی امی کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ تم اپنے کھانے اور رہنے کے اخراجات انہیں دے دیا کرنا تاکہ سسرال والے تمہاری امی کو طعنے نہ دے سکیں —— پھر ہم جلد ہی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کرلیں گے۔"

لیلیٰ نے ایک سرد آہ بھر کر کھلے آسمان کی جانب دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ عاصم کے ساتھ چلنے لگی۔

نسیمہ کو ایک سہاگن کی زندگی راس نہیں آئی۔
وہ ہمیشہ بیمار رہنے لگی تھی۔ اس کے خاوند عشرت علی کی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ مسلسل اس کی دوا دارو کا بار اٹھا سکتا۔
پھر ایسے میں نسیمہ کے پاؤں بھاری ہوگئے۔
لیلیٰ کو معظم ولا سے دو ماہ کی تنخواہ ملی تھی۔ وہ بھی چار پانچ ماہ میں

ہستہ آہستہ خرچ ہوگئی۔ نسیمہ اسے سمجھاتی رہی کہ وہ اس کے
لاج میں پیسے ضائع نہ کرے۔ لیکن لیلیٰ اپنے پلے پیسے رکھ کر
ں کی دکھ بیماری کیسے دیکھ سکتی تھی؟ اس لیے منع کرنے کے
جود اپنی مرضی کے مطابق اس کا علاج کراتی رہی۔
دوسری طرف سیٹھ مکرم نے پتہ نہیں آسیہ بیگم سے کس قسم کا
مجھوتہ کیا تھا اس سمجھوتہ کا فائدہ یہ ہوا کہ آسیہ بیگم نے آسیہ کیمیکل
ڈسٹری کے مالکانہ حقوق عاصم کے نام لکھ دیئے۔
— لیکن عاصم کے ستارے ابھی گردش میں تھے۔ خدا بخش اس کا
شمن گیا تھا اور اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعہ اسے نقصان پہنچانے
کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ کارخانہ کے احاطہ میں آئے دن فسادات
ہوتے رہتے تھے اور مشینوں کا نقصان ہوتا رہتا تھا۔
عاصم کے لیے دشواری یہ تھی کہ خدا بخش ان ہنگاموں میں نظر نہیں
آتا تھا۔ اس لیے کسی ثبوت کے بغیر اس کے خلاف قانونی کارروائیاں
بھی نہیں کی جا سکتی تھیں۔
خدا بخش نے عاصم سے تنہائی میں صرف دو مطالبات کئے تھے
ایک تو یہ کہ آسیہ کیمیکل انڈسٹری کے حقوق سے دست بردار
ہو جائے —— دوسرا یہ کہ آسیہ بیگم کا پتہ بتا دے۔
عاصم کو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ آسیہ بیگم کہاں روپوش ہوگئی ہیں سیٹھ
مکرم نے بھی لاعلمی ظاہر کی تھی۔ لہذا عاصم اپنے باپ کا دوسرا مطالبہ
پورا نہ کر سکا۔ اور پہلا مطالبہ تو وہ آخری دم تک پورا نہیں کر سکتا تھا
اس نے احتیاطاً تھانہ میں رپورٹ درج کرادی تھی اور کارخانہ میں

ہونے والے ہنگاموں کے سلسلے میں اپنے باپ پر شبہ کا اظہار
کیا تھا۔

لیکن ابھی تک خدابخش کسی قانونی گرفت میں نہیں آیا تھا آئے نہ
دن کے ہنگاموں کی وجہ سے کارخانہ خسارہ میں چل رہا تھا۔ اورعاصم ہوا۔
کی پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔

عاصم اور لیلیٰ پھر زندگی کی کڑی دھوپ سے گذرنے لگے۔

لیلیٰ پھر ملازمت کی تلاش میں ماری ماری پھرنے لگی۔ دن بلیٹتے
ہیں تو لوگوں کی نظریں بھی بدل جاتی ہیں۔ نسیمہ کے سسرال والوں
کے تیور بھی بدلتے جارہے تھے آٹھ ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اور
لیلیٰ اب تک ان پر بوجھ بنی ہوئی تھی — صرف بوجھ ہی کا سوال
ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ عشرت علی جانتا تھا کہ اس کی سالی ذہین
اور محنتی ہے۔ آج نہیں تو کل پھر کوئی بڑی تنخواہ والی نوکری پکڑ
لے گی — لیکن اصل اعتراض عاصم کے یہاں آنے پر تھا کہ وہ کیوں
آتا ہے۔ ؟ اور آتا ہے تو لیلیٰ سے تنہائی میں بیٹھ کر باتیں
کرتا ہے۔؟

بات بات پر اعتراضات ہونے لگے تھے۔ پھر یہ اعتراضات
رفتہ رفتہ بدنامی کی صورت اختیار کرنے لگے کہ وہ نوکری تلاش کرنے
کے بہانے باہر جاکر دوسرے چھوکروں سے ملتی رہتی ہے۔ ورنہ
بے روزگاری میں اس کے پاس روزانہ پانچ دس روپے کے نوٹ
کہاں سے آجاتے ہیں۔

حالانکہ یہ نوٹ امداد کے طور پر عاصم اسے دیا کرتا تھا۔ مگر دوسرے

لوگ کچھ اور انداز سے سوچتے رہے تھے۔

عاصم نے یہ بدنامی دیکھ کر وہاں آنا جانا ہی ترک کر دیا اس کے
سے سب سے زیادہ عشرت علی کو دلی اطمینان حاصل
نہ جانے وہ کیوں لیلیٰ کو اپنے ہاں رکھ کر اسے اپنی جاگیر
سمجھنے لگا تھا۔ عاصم اسے ملنے آتا تو اسے یہی محسوس ہوتا جیسے دشمن
چلا آیا ہے۔

لیلیٰ بھی نادان نہیں تھی وہ عشرت علی کی بدلی ہوئی نگاہوں کو
اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ سالی اور بہنوئی کے رشتہ کا فائدہ اٹھا
کر ایسی باتیں کہہ جاتا تھا کہ وہ بظاہر مذاق ہوتیں لیکن اس مذاق
کی گہرائی میں اترو تو عشرت علی کے دل کی گندگی ظاہر ہو جاتی
تھی۔

وہ الجھن میں پڑ گئی تھی۔ یہ بات کھل کر نہیں کہہ سکتی تھی۔
میں تمہاری سالی نہیں ہوں — سوتیلی بیٹی ہوں، جیسے تم میری بہن
سمجھ رہے ہو، وہ میری سگی ماں ہے۔

لیکن ایک جھوٹ بول کر وہ ساری زندگی کے لیے مصیبت
مول لے چکی تھی۔ اگر اب وہ سچ کہنا چاہتی تو سارا محلہ ان کے خلاف
ہو جاتا۔ کیونکہ ماں بیٹی نے ایک سے نہیں تمام محلے والوں سے
یہی کہا تھا کہ وہ سگی بہنیں ہیں — پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عشرت علی
نسیمہ کو طلاق دے دیتا — نسیمہ کو جو آخری سانس تک
زندگی گذارنے کے لیے ایک پناہ ملی تھی وہ پناہ گاہ بھی ہاتھ
سے نکل جاتی — لیلیٰ کا کیا تھا۔ وہ آج یہاں ہے تو کل نوکری

ملنے ہی اپنا دوسرا ٹھکانا ڈھونڈ سکتی تھی۔

اس کے بس میں ہوتا تو وہ ابھی اپنی ماں کا سسرال چھوڑ کر چلی جاتی۔ لیکن آجکل میں نسیمہ کی زچگی ہونے والی تھی اس لئے ایسے وقت میں ماں کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر نسیمہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔

بچہ بہت ہی تندرست تھا۔ لیکن ماں کی صحت ایک دم سے گر گئی۔

لیلیٰ پھر ڈاکٹروں کے پیچھے دوڑنے لگی —— عاصم سے جو روپے وقتاً فوقتاً اسے ملتے رہتے تھے وہ اس وقت کام آرہے تھے۔

زچگی کو ایک ہفتہ گذر گیا۔

لیکن نسیمہ کی حالت نہ سنبھلی اس کا جسم یوں سفید پڑ گیا تھا جیسے اب اس کے اندر خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔

اب وہ سدا بہار نسیمہ نہیں رہی تھی، مسلسل بیماری نے اس کی اصل عمر کی تصویر اس کے چہرے پر کھینچ دی تھی۔

عشرت علی بھی اب اس کی متواتر بیماری سے اور کچھ اس کے اچانک بڑھاپے سے اکتا گیا تھا اور بڑی بے دلی سے اس کے علاج وغیرہ میں دلچسپی لیتا تھا۔

اور لیلیٰ سوچ رہی تھی اب جلد از جلد کہیں سے ملازمت حاصل کرنی ہی پڑے گی۔ کہیں سے اتنے روپوں کا انتظام کرنا پڑے گا کہ ماں کی زندگی بچ جائے۔ جسے دیکھ کر عشرت علی پھر دل و جان سے

اس کی قدر کرنے لگے۔

پھر ایسی ہی ذہنی پریشانیوں کے وقت سیٹھ مکرم کی ایرکنڈیشنڈ کیڈیلاک اس کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔

اتنا بڑا کروڑپتی سیٹھ اس کے دروازے پر بہ نفس نفیس آجائے —— یہ ایک حیرت انگیز بات تھی —— لیکن سیٹھ صاحب محلے والوں سے اس کا پتہ پوچھتے پوچھتے آہی گئے تھے۔

لیلیٰ نے انہیں دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"آپ —— اور یہاں ؟"

"ہاں —— !" انہوں نے کار میں بیٹھے ہی بیٹھے جواب دیا "پیاسا ہمیشہ کنوئیں کے پاس آتا ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے اگر بہترین مستقبل بنانا چاہتی ہو پچھلی تلخیوں کو بھول جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ عاصم میرے آفس میں بیٹھا ہوا ہے اور تمہارا انتظار کر رہا ہے میں نے اسے یہاں آنے کے لیے کہا۔ شاید یہاں کے لوگ اس کا یہاں آنا گوارا نہیں کرتے اس لیے مجبوراً مجھے تنہا ہی آنا پڑا۔ کہو چل رہی ہو؟"

لیلیٰ شاید انکار کر دیتی۔ لیکن عاصم کا نام سن کر وہ انکار نہ کر سکی پھر اسے فوری طور پر ملازمت اور روپوں کی سخت ضرورت تھی۔

وہ ہچکچاتی ہوئی کہنے لگی۔

"دیکھئے —— !آپ نے عاصم کا حوالہ دیا ہے تو میں کبھی انکار نہیں کروں گی۔ لیکن اس وقت میری سسٹر کی حالت بہت ہی نازک

ہے۔ اگر ان کا خاطر خواہ علاج نہ ہوا تو میں ___"

سیٹھ مکرم نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اپنی سسٹر کا علاج تم نہیں کر سکتی ___ پیسہ کر سکتا ہے۔"

انہوں نے ڈیش بورڈ کھول کر نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پورے ایک ہزار ہیں۔ اپنے گھر میں کسی بھی مرد کو یہ رقم دیدو اور اس سے کہدو کہ اس شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر اور مہنگے سے مہنگے ہسپتال میں تمہاری سسٹر کا علاج کرائے ___ جاؤ یہ روپے دے کر جلدی آؤ ___"

لیلیٰ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے برے وقت میں سیٹھ مکرم فرشتہ بن کر پہنچ جائیں گے۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈی تھام لی۔

سیٹھ مکرم کے چیمبر میں لیلیٰ اور عاصم بیٹھے ہوئے تھے۔

مکرم صاحب انہیں آفس میں بٹھا کر کسی ضروری کام سے باہر

چلے گئے تھے۔ کام تو محض بہانہ تھا۔ وہ دراصل عاصم اور لیلیٰ کو تنہائی میں باتیں کرنے اور آپس میں مشورے کرنے کا موقعہ دے کر گئے تھے۔

لیلیٰ تھوڑی دیر تک عاصم کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ پھر پہلے والا تباہ حال عاصم نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ایک دن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے گئے تھے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ راتوں کو جاگتا رہتا ہے۔

لیلیٰ ہمدردی سے محبت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ عاصم سر جھکائے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیلیٰ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اس کے چہرے کو تھام کر بڑے ہی دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"نہ جانے ہماری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اتنی محنت اور جدوجہد کے بعد بھی ہم ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ پریشانیاں اور ناکامیاں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں آخر ہم کب تک یہ مصیبت اٹھاتے رہیں گے؟"

عاصم نے اس کی کمر کے گرد اپنی بانہوں کا حلقہ بنایا اور اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں لیلیٰ ___ ہماری جدوجہد کا انعام ہمیں ضرور ملے گا۔ دراصل اب تک ہم اکیلے تھے۔ اس دنیا میں کسی کا سہارا لئے بغیر اور کسی کو دوست بنائے بغیر دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مکرم صاحب نے ہماری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے انہوں نے میرے سامنے ایک شرط رکھی ہے کہ تم پھر سے ان کی ملازمت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ ——— تو وہ میری آسیہ کیمیکل انڈسٹری کو خسارے سے بچا لیں گے۔"

بلی نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

اگر سیٹھ صاحب آپ کو آئے دن کے نقصانات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ تو میں زندگی بھر ان کے جوتے صاف کرتی رہوں گی۔

عاصم نے گہری اداسی سے کہا۔

کوئی دوسرا وقت ہوتا میں کبھی تمہیں اس ملازمت کے لئے نہ کہتا۔ کیونکہ مکرم صاحب میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں۔ وہاں یہ خرابی بھی ہے کہ وہ مغرور ہیں۔ غریبوں کی عزت کو عزت نہیں سمجھتے۔ یاد ہے نا؟ اس رات انہوں نے کس طرح ہماری توہین کی تھی اور ہمیں کوٹھی سے دھکے دے کر باہر نکالنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

"آپ ان باتوں کو بھول جائیں عاصم ——! اس رات آپ نے بھی توہین کا بدلہ لے لیا تھا۔ اب اگر وہ خود بخود دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ اور کاروبار کے سلسلے میں آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں بھی ان کی عزت کرنی چاہیے۔

عاصم نے جواب دیا۔

ہاں —— !تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ ہمیں ان کی ضرورت اور انہیں ہماری ضرورت ہے —— ہماری ضرورت بلکہ صرف تمہاری ضرورت ہے۔

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انہیں میری ضرورت کیسے پڑ گئی۔ اس شہر میں مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی اور محنتی لڑکیاں ہیں۔ پھر وہ میرے دروازے پر کیوں دوڑے چلے آتے ہیں۔

عاصم اس کی بات کا جواب نہ دے سکا۔ اسی وقت دروازے پر کھٹکا سا ہوا —— بلی اس سے الگ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

دروازہ کھلا —— اور سیٹھ مکرم کا بھاری بھرکم وجود نظر آنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ریوالونگ چیئر پر آ کر بیٹھ گئے بلی نے بھی اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

"آپ —— شاید بہت مصروف ہیں؟"

"نہیں —— ایسی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ "اب ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔ میں نے تم دونوں کو اس لیے بلایا ہے کہ تم دونوں ذہین اور محنتی ہو۔ لیکن اتنی ذہانت اور محنت کے باوجود تم ناکامی کا منہ دیکھ رہے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عاصم کے پاس کاروباری دنیا کا تجربہ نہیں ہے —— میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ عاصم دلیر بھی ہے۔ آسیہ بیگم کے بھائی جیسے دشمن سامنے آ جائیں تو یہ نوجوان انہیں زخمی اور ناکارہ بنا سکتا ہے۔ لیکن خدا بخش جیسے چھپے ہوئے دشمن کا کچھ

نہیں بگاڑ سکتا ـــــ ڈھکی چھپی سازشوں سے صرف مجھ جیسے لوگ ہی نمٹ سکتے ہیں۔ کیونکہ میرے پاس دولت بھی ہے اور تجربہ بھی۔ ـــــ میں خدا بخش کے پالتوں غنڈوں کو یہاں بیٹھے بیٹھے خرید سکتا ہوں۔ اور انہیں خدا بخش کا دشمن بنا سکتا ہوں۔

میں نے عاصم سے ایک بار وعدہ کیا تھا کہ اسے دو دن کے اندر آسیہ کیمیکل انڈسٹری کے مالکانہ حقوق دلوا دوں گا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ تیسرے ہی دن سے عاصم اس کارخانہ کا مالک بن گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ سازشوں کی وجہ سے اب تک اس کارخانہ سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

آج پھر میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ہفتہ کے اندر میں اس کارخانہ کو خسارے سے نکال دوں گا۔ چند مہینوں میں عاصم کو اس قدر منافع حاصل ہوگا۔ کہ کبھی آسی اور خدا بخش نے اس کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

لیلیٰ نے خوش ہو کر کہا۔

"اگر ایسا ہو گیا تو میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی"

سیٹھ مکرم نے جواب دیا۔

صرف احسان ماننے سے کچھ نہیں ہوتا لیلیٰ! میں چاہتا ہوں کہ تم اس احسان کا بدلہ چکا دو ـــــ اس کے بدلے مجھ پر احسان کرو اور دوبارہ معظم کی گورنس بن جاؤ۔

"معظم" ـــــ!"

لیلیٰ اور عاصم دونوں انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

عاصم نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے ـــ کیا آپ نے ـــ معظم کو اپنا بیٹا تسلیم کر لیا ہے؟

انہوں نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ـــ کسی حد تک ـــ یا یوں سمجھ لو کہ ایک تجربہ کی حد تک میں نے اسے اپنی اولاد سمجھوں گا۔ اور آئندہ معظم کے کردار سے ـــ اس کے چال چلن سے اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ وہ بڑا ہو کر میرے نقش قدم پر چلتا ہے۔ یا خدا بخش کی طرح ذلت آمیز چال چلن اختیار کرتا ہے ـــ میرا نظریہ ہے جیسا خون ہوتا ہے۔ ویسی ہی اولاد بھی ہوتی ہے۔

شریف خون، شریف اولاد ـــ رذیل خون، رذیل اولاد ـــ یہی انسانی خون کا انعام ہے۔

معظم کے سلسلہ میں میری چند کمزوریاں ہیں۔ پہلی کمزوری تو یہ کہ بارہ سال سے ـــ بلکہ اب تیرہ سال ہو چکے ہیں۔ اتنی لمبی مدت سے میں ذہنی اور جذباتی طور پر اسے اپنا بیٹا سمجھتا رہا ہوں۔

دوسری کمزوری یہ کہ میری دوسری بیوی بانجھ ہے۔ اس سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ میرے لیے جائداد کا وارث پیدا کرے گی ـــ مگر ہاں وہ اپنی بہن اور بھائی کے بچوں کی پرورش اپنے ہاں کر رہی ہے۔ تاکہ کسی ہیرا پھیری سے یہ

ے پالک بچے میری جائداد کے حق دار بن جائیں۔

میری دوسری بیوی کا نام زرتاج بیگم ہے ــــ وہ ایک بہت ہی وفادار اور محبت کرنے والی بیوی ہے۔ لیکن اس میں بھی ایک کمزوری ہے ــــ اور وہ ہے دولت کی ہوس ــــ وہ معظم کا وجود برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ اس لیے میں معظم کو ان سے الگ رکھتا ہوں۔

اب تم لوگ میری پوزیشن کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ اگر میں معظم کو اپنا فرزند تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا۔ تو زرتاج بیگم اور اس کے خاندان والے کیا سوچتے؟

کیا ان کے دلوں میں یہ تجسس پیدا نہیں ہوتا کہ میں نے معظم کو فرزندی سے کیوں عاق کر دیا ہے؟

کیا وہ لوگ اس سلسلے میں چھان بین نہیں کرتے۔؟

کیا آسیہ ذلیل ہونے کے بعد مجھ سے انتقام لینے کے لیے مجھے بدنام نہیں کر سکتی تھی ــــ؟ وہ بہت کچھ کر سکتی تھی میرے خاندان میں میری عزت دو کوڑی کی بھی نہ رہتی ــــ"

معظم میرے لیے ایک کڑوا گھونٹ ہے۔ جسے میں نہ تو نگل سکتا ہوں اور نہ ہی اگل سکتا ہوں۔

اب تو بس ایک بے نام سی امید رہ گئی ہے کہ شاید وہ میرا ہی خون ہو ــــ خون بولتا ہے ــ خون ضرور بولتا ہے ــــ مجھے امید ہے کہ ایک دن وہ میرا خون ثابت ہو گا۔

وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو کر بیلی کو دیکھنے لگے۔

پھر انہوں نے کہا۔

بیلی ــــ! تم اور عاصم میرے ایک بہت بڑے راز سے واقف ہو گئے ہو۔ اب میں یہ نہیں چاہتا کہ معظم کے پاس کوئی دوسری گورنس آئے۔ کیونکہ میں اسے یہ تمام باتیں نہیں بتا سکوں گا ــــ تم ظاہر اور باطن کو اچھی طرح سمجھ چکی ہو اس کی روشنی میں تم جتنے بہتر انداز میں معظم کی پرورش کر سکتی ہو اس طرح کوئی دوسری گورنس نہیں کر سکتی۔

اس کے علاوہ ایک بات اور کہہ دوں کہ آسیہ خواہ کتنی ہی بدکردار ہو۔ معظم بدکردار نہیں ہو سکتا ــــ ابھی وہ بچہ ہے۔ معصوم ہے اور معصوم بچوں پر والدین کا گناہ نہیں تھوپنا چاہیئے اور نہ ہی انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

بیلی نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ والدین کی غلطیوں کی سزا اولاد کو نہیں ملنی چاہیئے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسی اولاد کی پرورش اس انداز میں کریں ــــ کہ اپنے والدین کی غلطیوں کو نہ دہرا سکے۔"

سیٹھ مکرم نے خوش ہو کر کہا۔

"تمہارا یہ جواب سن کر مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے۔"

"مگر ــــ!" بیلی نے کہا۔ "میں معظم ولا میں نہیں رہ سکوں گی ــــ"

"وہ کیوں ــــ؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

لیلیٰ نے جواب دیا۔

"اس لیے کہ وہاں پھر کسی رات کو آسیہ بیگم میرے لیے مصیبت بن کر آجائیں گی۔"

انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ آسیہ اب اس شہر میں کبھی نظر نہیں آئے گی۔

میں نے آسیہ کو پانچ لاکھ روپے نقد دے کر آسیہ کیمیکل انڈسٹری اور دونوں خاوندوں کا نکاح نامہ خرید لیا ہے۔ انڈسٹری کے حقوق میں نے عاصم کے نام لکھوا دیئے۔ تاکہ عاصم عدالتی کارروائی کر کے معظم کی حقیقت نہ ظاہر کر دے۔ اور ان دونوں نکاح ناموں کو میں نے جلا کر راکھ کر دیا ہے تاکہ وہ میری منکوحہ اور معظم کی ماں بننے کا دعویٰ نہ کرے ـــــ یوں بھی آسیہ اسی صورت میں محفوظ رہ سکتی تھی۔ کہ وہ خدابخش سے بہت دور چلی جائے ـــــ اس لیے وہ چلی گئی ہے ـــــ حقیقتاً وہ بڑی مکار عورت ہے۔ خدابخش اسے زندگی بھر ڈھونڈتا رہے لیکن اسے پا نہ سکے گا۔"

لیلیٰ نے مطمئن ہو کر عاصم کی جانب دیکھا۔

عاصم نے کہا۔

"مکرم صاحب ـــــ! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیلیٰ یہ ملازمت بخوشی کرے گی۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

"میں بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ خدابخش اب تمہارے کاروبار ر کاوٹ نہیں بنے گا ـــــ لیکن لیلیٰ کی ملازمت کے سلسلہ میں پہلے رائط طے ہو چکی ہیں انہیں اچھی طرح یاد رکھنا ـــــ لیلیٰ کو اپنا مستقبل سنوارنے یے جتنی رقم کی ضرورت ہو۔ مجھ سے لے سکتی ہیں۔ لیکن معظم کی مکمل ہونے سے پہلے نہ تو یہ ملازمت چھوڑ سکتی ہیں اور نہ ہی دی کر سکتی ہیں۔

ـــــ پہلے تو نو سال کا عرصہ تھا۔ اب تو آٹھ سال کی بات ہے۔ ٹھ سال دیکھتے ہی دیکھتے گذر جائیں گے۔"

لیلیٰ اور عاصم نے ایک دوسرے کی جانب حسرت بھری نظروں دیکھا۔ اور پھر ٹھنڈی سانسیں لے کر رہ گئے۔

لیلیٰ خوشی سے جھومتی ہوئی نسیمہ کے پاس آئی۔ تاکہ اسے اپنی ت کے سلسلہ میں خوشخبری سنا سکے ـــــ لیکن گھر کی دہلیز پر پہنچتے عورتوں کا رونا دھونا سن کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ لیلیٰ کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے۔ دہلیز پار کر کے گھر اندر جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ

سینے پر رکھ کر بڑبڑانے لگی۔

"ہائے امی ۔۔۔! مجھے اکیلی چھوڑ کر نہ جانا ۔۔۔ یاخدا ۔۔۔! یہ کیسی زندگی ہے کہ ایک خوشی ملتی ہے اور دوسری بچھڑ جاتی ہے"

اس نے بڑی مشکلوں سے دہلیز کو پار کیا۔

عورتوں کے بین کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ کانپتے ہوئے قدموں سے ہولے ہولے یوں بڑھ رہی تھی جیسے اب تب ہیں گرنے ہی والی ہو

اسی وقت کمرے کے اندر سے عشرت علی کی آواز سنائی دی وہ اپنی والدہ سے کہہ رہا تھا۔

"اماں ۔۔۔ چپ بھی کرو ۔۔۔ یہ دیکھو سانس آ رہا ہے ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ ابھی زندہ ہے ۔۔۔

عورتوں کو اچانک چپ سی لگ گئی۔

"امی ۔۔۔!" لیلیٰ کے حلق سے ایک چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی وہ دوڑتی ہوئی کمرے کے اندر آئی اور چارپائی کے قریب ٹھٹھک کر رہ گئی۔

نسیمہ کی آنکھیں بند تھیں۔ عشرت اس کی نبض تھامے بیٹھا ہوا تھا۔ لیلیٰ کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"نبض چل رہی ہے۔ میں اب تک دو ڈاکٹروں کو لا چکا ہوں تین بار انجکشن لگ چکے ہیں۔ لیکن کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

لیلیٰ نے نسیمہ کے سرہانے رکھی ہوئی ڈھیر ساری دواؤں کو دیکھ کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ سسٹر کو امریکن ہسپتال میں داخل کرایا جائے ۔۔۔ آپ فوراً جائیے ۔۔۔ اسپیشل وارڈ کا پیشگی کرایا ادا کیجئے اور وہاں سے ایمبولینس لے آجائیے۔

عشرت اٹھنے لگا۔

اسی وقت نسیمہ نے ہونٹ کھول کر بڑی نقاہت سے کہا۔

"نہیں ۔۔۔!"

عشرت جاتے جاتے رک گیا۔

نسیمہ حسرت بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے جیسے وہ لیلیٰ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔

لیکن وہ دل کی بات نہ کہہ سکی۔

"بیٹی ۔۔۔!" اس کے سینے سے ایک آہ نکل کر رہ گئی۔ وہ اتنے سارے لوگوں کے سامنے اسے بیٹی بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

اس نے بڑی ہی دکھ بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اپنی سانسوں کے درمیان اٹکتے ہوئے کہا۔

"م ۔۔۔ میں ۔۔۔ ج ۔۔۔ جا ۔۔۔ رہی ہوں۔

اس نے اپنا ایک کمزور ہاتھ اس کی جانب بڑھایا لیکن لیلیٰ سے پہلے ہی عشرت کی والدہ نے اس ہاتھ کو تھام لیا۔

لیلیٰ دوسری طرف جا کر ماں کا ہاتھ تھام سکتی تھی مگر ادھر عشرت بیٹھا ہوا تھا ۔۔۔ ماں سسرالی رشتوں میں گھری ہوئی تھی اور بیٹی ۔۔۔ سگی بیٹی ۔۔۔ محلے کی دوسری عورتوں کی طرح دور

کھڑی رہ گئی تھی۔

اب وہ کس راستے سے ماں کے قریب جا سکتی تھی ---؟ اس کے قدموں کی طرف جاتی تو نظروں سے دور ہو جاتی --- مگر اس وقت نظروں کے سامنے رہنا ضروری تھا --- وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو نہیں تھام سکتی تھیں --- وہ زبان سے ایک دوسرے کو ماں بیٹی نہیں کہہ سکتی تھیں --- لیکن دور رہ کر بھی نگاہوں سے ایک دوسرے کو پکار رہی تھیں۔

"ہائے امی --- ! مجھے کیا معلوم تھا کہ ہم اس طرح قریب رہ کر بھی دور ہو جائیں گی ---"

اسی وقت ایک بوڑھی عورت نسیمہ کے ننھے بیٹے کو اس کے قریب لے آئی اور نسیمہ سے کہنے لگی۔

"اے بیٹی --- ! اپنے بچے کو دودھ بخش دو ---"

اچانک نسیمہ کی آنکھوں سے ایک کرب جھلکنے لگا --- ماں اپنی موت سے پہلے بچوں کو دودھ بخشتی ہے۔ لیلیٰ بھی تو اس کی بیٹی تھی ---

--- اس کا پہلا فرض تو یہی تھا کہ وہ بیٹی کو دودھ بخشتی ---

لیکن وہ اتنی ساری عورتوں کے سامنے یہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ میں پہلے اپنی مظلوم اور مزدور بیٹی کو دودھ بخشوں گی۔

اس دنیا میں کس کا مول زیادہ ہے --- خون اور پسینے یا ماں کے دودھ کا ---؟

بیٹی نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے ماں کی پرورش کی تھی۔

لیکن پھر بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اولاد ساری زندگی اپنا خون جلاتی رہے --- پسینہ بہاتی رہے۔ پھر بھی ماں کے دودھ کی قیمت ادا نہیں کر سکتی۔ اس لیے تو بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ دودھ کی قیمت بہت بھاری ہے۔ اولاد اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی --- اس کا بدلہ نہیں چکا سکتی --- اس کا معاوضہ نہیں دے سکتی۔ لہٰذا ماں کا فرض ہے کہ وہ دودھ کی قیمت معاف کر دے۔

نسیمہ کی دم توڑتی ہوئی نگاہوں کے سامنے ایک بیٹی دودھ کا احسان اٹھائے کھڑی تھی۔

بیٹی نے اپنی زندگی میں ماں پر کتنے ہی احسانات کیے تھے۔ ماں نے دودھ پلا کر ایک احسان کیا تھا۔ مگر وہ اس احسان کو معاف نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے ---"

"لوگو --- ! ایسی دردمند اور محبت کرنے والی بیٹی کیا تم نے دیکھی ہے۔

یہ میری خاطر اپنے عاصم سے آٹھ سال کے لیے جدا ہو گئی ہے۔ اگر یہ آٹھ سال کی شرط منظور نہ کرتی اور سیٹھ مکرم کی ملازمت قبول نہ کرتی تو مجھے کس طرح سہاگن بناتی --- !

مجھے سہاگن بنانے کے لیے یہ اپنے سہاگ کے سپنوں کو کچل رہی ہے۔ یہ لڑکی آٹھ سال تک اپنے ارمانوں سے اور اپنی جوانی کے تقاضوں سے لڑتی رہے گی۔

لیکن میں اسے بیٹی کہہ اپنے دودھ کی قیمت معاف نہیں کر

سکتی ـــــ کیونکہ میں تو آخری بار اسے بیٹی کہہ کر اپنی حسرت پوری کر لوں گی ۔ لیکن یہ تمام زندگی لوگوں میں بدنام ہوتی رہے گی کہ اس نے ماں کو جوان ثابت کرنے کے لیے بہن کا جھوٹا رشتہ بنا لیا تھا لوگ میری بیٹی کو جھوٹی اور فریبی کہہ کر تمام زندگی اسے دکھ پہنچاتے رہیں گے ـــــ نہیں میں اپنی زبان سے اسے دودھ نہیں بخشوں گی ـــ"

لیلیٰ آنسو بھری آنکھوں سے ماں کی بے بسی کو دیکھ رہی تھی۔

بیٹی کی خاموش نگاہوں نے کہا۔

"اچھا تو ہے امی ـــ !" دل کی بات زبان پر نہیں آنا چاہیے لیکن یہ دل بھی تو نہیں مانتا ۔ یہ دل بار بار مچل رہا ہے کہ میں ایک بار چیخ کر اپنی زبان سے آپ کو "امی" کہوں ـــ کیا میں اتنی قربانیاں دے کر آخری بار آپ کو امی نہیں کہہ سکتی۔

ہائے یہ کیسی ظالم مجبوری ہے۔

میں نے لالچی اور ہوس بھری نگاہوں سے آپ کو بچانے کے لئے یہ پناہ گاہ تلاش کی تھی ۔ اس پناہ گاہ میں آپ کو سب کچھ مل گیا ـــ لیکن میں پھر بھی خالی ہاتھ رہی ـــــ میں چار عورتوں میں بیٹھ کر بہ فخر سے نہیں کہہ سکتی ـــ کہ میری ماں نے مجھے دودھ بخشا ہے۔

دودھ انسان کا پہلا چسکا ہے۔

یہ پہلی خوراک ہے جو انسان کے حلق میں ٹپکتی ہے۔

دودھ ممتا کا پہلا بوسہ اور ماں کی آخری بخشش ہے ۔ جب

تک ماں اولاد کو اپنا دودھ نہیں بخشتی ۔ اس وقت تک خدا بھی اولاد کی غلطیوں کو معاف نہیں کرتا۔

"ہائے امی ـــ !" میں نے زندگی میں آپ سے کچھ نہیں مانگا ـــ آخری بار کچھ مانگنے کی خواہش بھی ہوئی تو آپ مجبور ہو گئیں ـــ"

نسیمہ کا سر تھرتھرانے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سانس رک رہی ہو۔

وہ اپنی آخری تمام قوتوں کو سمیٹ کر لیلیٰ کو خاموش نگاہوں سے کہنے لگی۔

"مم ـــ میں ـــ تجھے بدنام نہیں کروں گی ـــ میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی ـــــ اس لیے کہ دودھ بچوں کو بخشا جاتا ہے ۔ اور تو مجھ سے بڑی ہے۔

مجھ سے بھی عظیم ہے ۔ میری بیٹی !

میری بچی ! دودھ بخشنا کوئی بڑی بات نہیں ۔ اس کا حساب روز حشر میں خدا کے سامنے ہوگا۔

لیکن آج ـــ آج میں جاتے جاتے تیری عظمت کو سلام کرتی ہوں ـــ"

نسیمہ کا کمزور ہاتھ تھرتھراتا ہوا اٹھا ـــــ عورتوں نے یہی سمجھا کہ وہ ننھے بچے پہ ہاتھ رکھ کر دودھ بخشنا چاہتی ہے ـــ ـــ لیکن وہ ہاتھ بمشکل نسیمہ کی پیشانی تک گیا ـــ اور پھر بے دم ہو کر گر پڑا۔

اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔
وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھی
بین کرنے والی عورتوں نے ایک سر میں چیخنا شروع کر دیا۔ اور پھر ان چیخوں کے درمیان ایک چیخ لہرائی۔
"ام ــــ می ــــ ی ــــ ی ــــ"
وہ ماں کے قدموں پر گر پڑی۔
رونے اور چیخنے چلانے کے ہنگاموں میں کسی نے اس حقیقت پر توجہ نہیں دی کہ لیلیٰ اپنی ماں کے قدموں سے لپٹ کر "امی" کہتی ہوئی بین کر رہی ہے۔

چھ ماہ کا عرصہ گذر گیا۔
رفتہ رفتہ لیلیٰ کے دل سے ماں کی موت کا صدمہ کم ہوتا گیا۔ اور وہ اپنے ملنے والوں کے ساتھ ہنسنے بولنے لگی۔
نہ خوشی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اور نہ غم سدا سلامت رہتا ہے۔ وقت بہت بڑا معالج ہے۔ آہستہ آہستہ زخموں پر مرہم رکھ دیتا ہے۔
لیلیٰ برائے نام ایک گورنس تھی۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ وہ معظم ولا

کی مالکہ بنی ہوتی تھی۔ قیمتی ملبوسات ــــ لذیذ کھانے ــــ ایر کنڈیشنڈ خواب گاہ ــــ سیر و تفریح کے نت نئے پروگرام ــــ یہ سب ایسی چیزیں تھیں، جو اس کے ماضی کی تلخیوں کو بھلا رہی تھیں۔
وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ کسی شہزادی کی طرح بڑی شان سے اپنی مخصوص کار میں آتی جاتی تھی۔ کالج سے واپس آکر معظم کو پڑھاتی تھی پھر اس کے ساتھ کھیل کود اور دوسری دلچسپیوں میں مصروف ہو جاتی تھی۔
ہفتہ کا ایک دن عاصم کے لئے مقرر تھا۔
یہ ایک دن ایسا تھا کہ اس دن اسے خوشیوں کا احساس بھی ہوتا اور محرومیوں کا بھی ــــ محرومیوں کا احساس اس لئے کہ عاصم کے ہوتے ہوئے بھی عاصم کی نہیں تھی۔
یہ ایک دن اس کے اندر کی چنگاری کو بھڑکا دیتا۔ اور اس کے اندر سرگوشی کرتا کہ اب وہ بچی نہیں ہے جوان ہوگئی ہے۔ اور جوانی کے اپنے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔
زندگی کی تمام نعمتیں میسر تھیں۔ صرف اس کے ارمانوں پہ پہرے بیٹھا دیئے گئے تھے۔
سیٹھ مکرم ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ لیلیٰ اور عاصم ایک نہ ہونے پائیں۔ ورنہ ان کے بیٹے کی تعلیم پوری توجہ سے نہ ہو سکے گی۔
وہ ہمیشہ لیلیٰ کو سمجھایا کرتے تھے کہ اپنے نفس کو مارنا بڑے حوصلہ

کا کام ہے۔ ایک شاندار مستقبل بنانے کے لئے انسان اپنی خواہشات کو کچلتا رہتا ہے ۔ اور اب تو صرف سات سال اور چھ ماہ کا عرصہ رہ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ خود باپ بنکر لیلیٰ کو سہاگن بنائیں گے۔ اور اسے ڈولی میں بٹھا کر عاصم کے ساتھ رخصت کریں گے۔

عاصم کا کاروبار بھی سنبھل گیا تھا

سیٹھ مکرم نے جیسا کہا تھا۔ ویسا کر دکھایا ۔ اب خدا بخش اور اس کے غنڈے دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ آسیہ کیمیکل انڈسٹری اچھے خاصے منافع کے ساتھ چل رہی تھی۔ اور آثار بتا رہے تھے کہ آئندہ چند برسوں میں اس کا منافع دوگنا ہو جائے گا۔

یہ سب سرمائے اور سیاست کی چالبازیاں تھیں سیٹھ مکرم اکثر عاصم سے کہا کرتے تھے کہ ایک فیکٹری یا مل قائم کرنے کے لئے صرف مشین نہیں خریدی جاتیں ۔ غنڈوں اور شر پسندوں کو بھی خریدا جاتا ہے۔ اور انہیں خرید کر خدا بخش جیسے چالبازوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔

عاصم ان کے ساتھ رہ کر کاروباری داؤ پیچ سیکھتا جا رہا تھا

رفتہ رفتہ وقت گذرتا جا رہا تھا۔

ایک کے بعد ایک موسم آتا۔ اور اپنی نرمی گرمی دکھلا کر چلا جاتا لیلیٰ ہر نئے موسم کے ساتھ کھلتی جا رہی تھی۔

وہ ایک ایسی بہار تھی، جسے عاصم دیکھ سکتا تھا، مگر چھو نہیں سکتا تھا

ہفتہ کے دن ہی ہوتا ۔ کہ وہ اس کے ساتھ گھومتا پھرتا ۔ باغوں میں، بازاروں میں، کلبوں میں وہ شانہ بشانہ ہوتے۔ مگر پھر بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے۔

لیلیٰ بہت محتاط رہتی کہ سیٹھ مکرم سے کیا ہوا وعدہ ڈگمگا نہ جائے

ہر ہفتہ کی شام کو جب عاصم اسے معظم ولا کے گیٹ پہ چھوڑنے کے لئے آتا تو بڑی حسرت سے کہتا۔

"اب چھ سال دو مہینے اور دو ہفتے باقی رہ گئے ہیں"

لیلیٰ ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتی"

یہ وقت بھی کسی نہ کسی طرح گذر ہی جائے گا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بہت دیر تک کھڑے رہتے بس یہ ہاتھ ہی تھے، جو ان کے ہاتھوں میں تھے۔ پھر یہ ہاتھ بھی آئندہ ہفتہ تک ملنے کی آس میں بچھڑ جاتے۔

"لیلیٰ ۔!" عاصم کہتا "کبھی کبھی جی چاہتا ہے سیٹھ مکرم سے کئے ہوئے تمام وعدوں کو بھول جاؤں۔ اور تمہیں یہاں سے چرا کر لے جاؤں...."

"توبہ ہے ۔!" وہ کہتی "بھلا اپنی چیز بھی کوئی چراتا ہے، میں آپ کی ہوں۔ جب کہیں آپ کے پاس چلی آؤں ۔ مگر عاصم ۔! اگر ہم عہد سے پھر گئے۔ اور وقتی خوشی حاصل کر لی تو زندگی بھر وعدہ شکنی کا احساس ستاتا رہے گا۔ ہم فخر سے یہ کہہ سکتے کہ اپنی زبان کے سچے ہیں

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتا۔

"میں آپ کی ہوں عاصم ـــ !
آپ میرا انتظار کریں
اب تو صرف چھ سال دو مہینے اور دو ہفتے رہ گئے ہیں
پھر چھ سال بھی گذر جائیں گے
دو مہینے اور دو ہفتے بھی گذر جائیں گے۔
وقت ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ یہ ہمارے درمیان دیوار بن کر نہیں رہ سکتا۔ اسے گذرنا ہے۔ اور یہ گذر ہی جائے ....
پھر معظم ولا کا بڑا پھاٹک بند ہو جاتا۔
"عاصم ـــ خدا حافظ .... !"
دور ایک مترنم سی آواز لہراتی اور وہ معظم ولا کے خوبصورت جیل خانہ میں قید ہو جاتی ..... !

ختم شد